مولانا طارق جمیل صاحب کی بے اعتدالیاں اور ان کا جواب

بسم الله حامدا و مصليا!

حضرت مولانا مفتی عیسیٰ خان صاحب مدظلہ اور ان کے ساتھیوں کی جانب سے مولانا طارق جمیل صاحب کی کچھ تقریروں کی نقل موصول ہوئی۔ اس پر انہوں نے ہماری رائے بھی مانگی ہے۔ ہمارے ساتھیوں نے C.D پر اصل تقریر کو تحریر سے ملایا تو مطابق پایا۔ اس پر ہم نے چیدہ چیدہ امور میں مولوی طارق جمیل صاحب کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور ساتھ میں حق بات کو بھی بیان کیا ہے۔

مولانا الیاس ؒ کے چلائے ہوئے کام کو ہم اپنا کام سمجھتے ہیں لیکن مولوی طارق جمیل صاحب کی علمی و عملی بے اعتدالیاں بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ اس طرح کے نادان دوستوں کی وجہ سے تبلیغ کے کام پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہوگیا ہے۔

اس لئے اگرچہ ذہن میں کچھ لکھنے کا پہلے سے پروگرام تھا لیکن اب جب کہ ایک سنجیدہ حلقہ کی طرف سے مولوی طارق جمیل صاحب کے فرمودات کی نقل بھیجی گئی تو بنام خدا **الـدين النصيحة** اور **امر با لمعروف و نهي عن المنكر** کے تحت مولوی طارق جمیل صاحب کی بے اعتدالیوں کو کھولا ہے۔

تبلیغ کے ذمہ دار حضرات سے استدعا ہے کہ وہ خود بھی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں، سنجیدہ و محتاط طرز عمل اختیار کریں اور مولوی طارق جمیل جیسے جوشیلے لیکن غیر محتاط حضرات کو بے اعتدالیوں سے روکیں ورنہ یہ کام کو بھی اور کام کے ذمہ داروں کو بھی نقصان پہنچائیں گے۔

وما علينا الا البلاغ.

13 جمادی الاولیٰ 1429ھ

ڈاکٹر مفتی عبدالواحد

دارالافتاء۔ جامعہ مدنیہ۔ لاہور

پہلی بحث

عصمت یا حفاظت صحابہ رضی اللہ عنہم

مولوی طارق جمیل صاحب کہتے ہیں:

''اگر آپ ا (خلیفہ) متعین کرتے اور پھر اس پر کوئی انکار کرتا تو یہ ہلاک ہو جاتا۔ اور دوسری بات بھی تھی کہ آپ امتعین کرتے اور اس میں کوئی کمی ہوتی اور ہونی تھی۔ چونکہ اب یہ دنیا کی تاریخ میں پہلی دفعہ ہونے لگا ہے کہ معصوم کی جگہ غیر معصوم بیٹھے گا تو غیر معصوم ہے ہی اس لئے کہ اس نے خطا کرنی ہے۔ اللہ کے نبی انتخاب فرما کے اپنی جگہ بٹھا دیں پھر اس میں کوئی کمی کوتاہی آئے تو وہ اللہ کے نبی کی طرف منسوب ہوگی...... تو یہ دو چیزیں تھیں۔ اللہ کے نبی تعیین کے بغیر چلے گئے۔ تعیین کرنے سے کوئی انکار کرتا۔ انکار تو ہونا تھا۔ اب سعد بن عبادہ نہیں مانے آخر تک نہیں مانے۔ خالد بن سعید بن عاص نہیں مانے۔ علی نہیں مانے بعد میں حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد بیعت فرمائی۔ خالد بن سعید نے بھی چار پانچ مہینے لگا دیئے تھے پھر جا کے بیعت فرمائی۔ تو تعیین کے بعد فرض کرو یہ سارے ہی مان جاتے جب اللہ کے نبی نے کہہ دیا تو پھر کون انکار کرتا؟ سارے ہی مان جاتے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جو کمی بیشی ہونی تھی بطور انسان۔ نہ ہم ان کو معصوم سمجھتے ہیں نہ محفوظ سمجھتے ہیں۔ یہ بھی میں تمہیں بار بار کہتا ہوں۔ یہ غلو ہے شیعوں کے رد میں حد سے تجاوز کرنا۔ ہم کسی کے رد میں اپنا راستہ نہ چھوڑیں گے...... تو چونکہ یہ ہونے والا تھا ان سے بشری خطا ہونی تھی اس پر کوئی اگر تبصرہ کرتا یہ کیا کر دیا تو یہ طعن اللہ کے نبی کی طرف ہو جانا تھا۔ یہ اشد تھا ہلاکت کے لئے ...... ابوبکر رضی اللہ عنہ 99 فیصد عصمت کے قریب ہو گئے لیکن 100 نمبر نہیں لے سکے۔ 100 نمبر لینے والا تو معصوم ہوتا ہے

لہٰذا ہم انہیں ساڑھے 99 نمبر تو دے سکتے ہیں آدھا چھوڑ دیں گے تاکہ نبی اور غیر نبی میں فرق رہے۔"

ہم کہتے ہیں

مولوی طارق جمیل صاحب نے اس مقام میں کئی غلطیاں کی ہیں جن کا بیان ذیل میں ہے:

1- مولوی طارق جمیل صاحب کو اول تو عصمت کا مطلب ہی معلوم نہیں۔ عصمت کا مطلب ہے۔

خلق مانع عن المعصية غير ملجئ اى بل يبقى معه الاختيار.

عصمت ایسا خلق اور وصف ہے جو بغیر مجبور کئے معصیت سے روکتا ہے یعنی اس وصف کے ساتھ اختیار باقی رہتا ہے۔

و التعريف الثانى (اى التعريف المذكور) يلائم قول الامام ابى منصور الماتريدى العصمة لا تزيل المحنة اى الا بتلاء المقتضى لبقاء الاختيار. قال صاحب البداية و معناه يعنى قول ابى منصور انها لا تجبره على الطاعة و لا تعجزه عن المعصية بل هى لطف من الله تعالىٰ يحمله على فعل الخير و يزجره عن فعل الشرمع بقاء الاختيار تحقيقا للا بتلاء اه. (المسامره على المسايره ص 205).

عصمت کی مذکورہ بالا تعریف امام ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ کے اس قول کے موافق ہے کہ عصمت سے ابتلاء اور آزمائش زائل نہیں ہو جاتی جو اختیار کے باقی رہنے کا تقاضا کرتی ہے۔

صاحب بدایہ کہتے ہیں کہ امام ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ عصمت کی وجہ سے نبی نیکی کرنے پر مجبور اور معصیت کرنے سے عاجز نہیں ہو جاتا بلکہ عصمت تو اللہ تعالیٰ کا لطف اور اس کی مہربانی ہوتی ہے کہ جو نبی کو بھلے عمل پر ابھارتی ہے اور برے عمل سے روکتی ہے اور عصمت کا یہ عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب نبی کا اختیار باقی ہو۔

غرض عصمت گناہ و معصیت سے ہوتی ہے غلط فہمی یا اجتہاد میں خطا اور چوک ہونے سے نہیں ہوتی۔ انبیاء علیہم السلام سے ان کے معصیت سے معصوم ہونے کے باوجود خطا یا غلط فہمی کا صدور ہو سکتا ہے۔

(2) انبیاء علیہم السلام معصیت سے معصوم ہوتے ہیں۔ کوئی غیر نبی بھی معصیت سے معصوم ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں شریعت خاموش ہے۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ اپنی کتاب عبقات میں لکھتے ہیں۔

''بعض لوگوں کو اس مسئلہ پر شدت سے اصرار ہے کہ پیغمبروں کے سوا عصمت کی صفت کا انتساب کسی دوسرے کی طرف جائز نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس سے کیا مطلب ہے؟

اگر یہ غرض ہے کہ پیغمبروں کے سوا کسی دوسرے کے لئے عصمت کی صفت شریعت سے ثابت نہیں تو علاوہ اس اعتراض کے یعنی آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کے متعلق جو یہ فرمایا ہے کہ **الحق ینطق علی لسان عمر** (یعنی حق عمر کی زبان پر بولتا ہے) یا حضرت علیؓ کے بارے میں فرمایا **دار الحق مع علی حیث دار** (یعنی علی کے ساتھ حق گھوم جاتا ہے جدھر بھی علی گھومے) پیغمبر کے ان اقوال کی یا ان ہی جیسے دوسرے اقوال جن کا مفاد بھی یہی ہے ان سب کی خواہ مخواہ تاویل کرنی پڑے گی۔

اور اگر ان کی غرض یہ ہے کہ واقع میں پیغمبروں کے سوا عصمت کی صفت کسی دوسرے انسان کے لئے ثابت نہیں ہوسکتی تو ظاہر ہے کہ اس دعویٰ کے اثبات میں دلیل پیش کرنا ان کا فرض ہے کیونکہ شرعی طور پر زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ شریعت پیغمبروں کے سوا دوسروں کی عصمت کے متعلق خاموش ہے لیکن کسی چیز سے خاموشی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ شریعت اس کی منکر ہے۔

(علاوہ ازیں) مسئلہ میں کچھ تفصیل بھی (ہوسکتی) ہے یعنی عصمت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عصمت مطلقہ جس کا مطلب یہ ہے کہ (زندگی کے سارے شعبوں) افعال و اعمال و اقوال و علوم میں عصمت کو ثابت کیا جائے۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ جس منصب کے فرائض اس شخص کے سپرد ہوئے ہیں اس منصب سے جن امور کا تعلق ہے ان میں وہ معصوم ہوتا ہے یعنی غلطی ان خاص امور میں اس سے صادر نہیں ہوسکتی......'' (عبقہ 11 اشارہ 4)

3- مولوی صاحب کہتے ہیں کہ ''حضرت ابوبکرؓ سے جو کمی بیشی ہونی تھی بطور

انسان"۔

سب سے پہلے تو ہم مولوی طارق جمیل صاحب سے یہ پوچھیں گے کہ حضرت ابوبکرؓ سے جو بشری خطا ہوئی وہ کیا تھی؟ اسی طرح اگر وہ ہمیں خلفائے اربعہ کی بشری خطاؤں کی فہرست فراہم کر دیں تو ہم بھی اپنی ایمانیات پر نظر ثانی پر مجبور ہو جائیں گے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ کمی بیشی میں دو احتمال ہیں:

ا۔ اگر کمی بیشی سے مراد معصیت ہے تو یہ بڑی جسارت کی بات ہے کہ انبیا علیہم السلام کے بعد سب سے افضل انسان کی طرف کسی شرعی یا حسی دلیل کے بغیر ہی معصیت کی نسبت کی جائے کیونکہ یہ کہنا کہ وہ آدھا فیصد گناہگار ہیں سب وتنقید میں شمار ہوتا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

i- عن ابی سعید الخدری قال قال النبی ﷺ لا تسبوا اصحابی فلو ان احد کم انفق مثل احد ذهبا ما بلغ مد احد هم و لا نصیفه. (بخاری و مسلم)

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں نبی ﷺ نے فرمایا میرے صحابہؓ کو برا مت کہو (ان پر تنقید مت کرو اور ان کے بارے میں کوئی نازیبا کلمہ منہ سے نہ نکالو کیونکہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ان کا ایمان و یقین اور دین کے لئے ان کی قربانیاں انتہائی درجے کی ہیں۔ انہی باتوں سے اعمال کی قیمت لگتی ہے اور بڑھتی ہے۔ اور تم ان کے درجے کے نہیں ہو) تو تمہارا کوئی شخص اگر احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو (قدر و قیمت کے اعتبار سے) وہ ان کے کسی ایک کے ایک مد (یعنی 3/4 کلو) یا (بلکہ اس کے) نصف مد (یعنی 3/8 کلو) کے برابر کو بھی نہیں پہنچے گا۔

ii- ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی بات سے حضرت عمرؓ کو ناراض کر دیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے معافی بھی مانگی لیکن حضرت عمرؓ نہ مانے۔ حضرت ابوبکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ بعد میں حضرت عمرؓ کو بھی ندامت ہوئی اور وہ بھی ان کو ڈھونڈتے ہوئے مجلس نبوی میں پہنچ گئے۔ وہاں حضرت عمرؓ نے واقعہ سنانا شروع کیا۔

فجعل وجه رسول ﷺ یتمعر حتی اشفق ابوبکر فجثا علی رکبتیه فقال یا رسول الله والله انا کنت اظلم......فقال رسول الله ﷺ هل انتم تار کو لی صاحبی

هل انتم تارکو لی صاحبی انی قلت یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا فقلتم کذبت و قال ابوبکر صدقت. (بخاری).

اس پر رسول اللہ ﷺ (سخت غصہ ہوئے اور آپ) کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا یہاں تک کہ ابوبکر ؓ کو اندیشہ ہوا اور وہ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عرض کرنے لگے یا رسول اللہ ﷺ خدا کی قسم زیادتی میں نے ہی کی تھی۔ تاہم رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم میری خاطر میرے دوست کو نہیں چھوڑ سکتے؟ کیا تم میری خاطر میرے دوست کو نہیں چھوڑ سکتے؟ (اس وقت کو یاد کرو جب شروع میں) میں نے کہا تھا اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں تو (شروع میں) تم سب نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو اور (یہ صرف) ابوبکر (تھے جنہوں) نے کہا کہ آپ سچ کہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ تو حضرت عمر ؓ کو بھی حضرت ابوبکر ؓ کی سچی شکایت کرنے کا موقع نہیں دے رہے۔

مولوی طارق جمیل صاحب اپنی نادانی سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر ؓ کو آدھا فیصد گناہگار قرار دینے پر مصر ہیں انا للہ و انا الیہ راجعون.

II- اور اگر کمی بیشی سے مراد اجتہادی غلطی و خطا ہے تو اول تو یہ کوئی عیب کی بات ہی نہیں ہے۔ دوسرے خلفائے راشدین اور خصوصاً حضرت ابوبکر و عمر ؓ کے اجتہاد کو شارع کی نظر میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

i- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین. (احمد)

لازم پکڑو میری سنت کو اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کو۔

ii- **عن حذیفۃ قال قال رسول اللہ ﷺ انی لا ادری ما بقائی فیکم فاقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر. (ترمذی و احمد)**

حضرت حذیفہ ؓ کہتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا میں نہیں جانتا کہ میں تم میں (مزید کتنی مدت رہوں گا۔ (تو) تم میرے بعد جو دو ابوبکر و عمر ہوں گے ان کی اقتدا کرنا۔

تنبیہ: اجتہاد کی غلطی کی اگر اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے نشاندہی کر دی جائے تو

صرف اسی وقت وہ یقینی طور پر خطا ہوگی جیسا کہ حضرت معاویہ ؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمار بن یاسر ؓ کو بتایا کہ

تقتلک الفئة الباغية.

تمہیں باغی جماعت قتل کرے گی۔

شریعت کی نظر میں باغی اس کو کہتے ہیں جو امام حق کے خلاف ناحق خروج کرے اگرچہ اس کی بنیاد اس کے اجتہاد پر ہو۔ حضرت معاویہ ؓ نے اپنے اجتہاد کی بنیاد پر حضرت علی ؓ کے خلاف خروج کیا اور حدیث نے بتایا کہ وہ امام حق کے خلاف ناحق تھا۔ لہٰذا حضرت معاویہ ؓ کے اجتہاد کا خطا ہونا ہمیں معلوم ہوگیا۔

خلفائے اربعہ کے کسی اجتہاد کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایسی کوئی تصریح تو کیا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ ان کا اجتہاد اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں پسندیدہ نہیں تھا۔

4- مولوی طارق جمیل صاحب خلیفہ کی تعیین نہ ہونے کی ایک حکمت یہ بتاتے ہیں کہ ''تعیین کرنے سے کوئی انکار کرتا۔ انکار تو ہونا تھا...... یعنی یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا یا آپ کو قوی اندیشہ تھا کہ انکار تو ہوگا ہی۔ اور تعیین کے بعد انکار سخت ہلاکت کی چیز ہے۔ اس سے بچانے کے لئے آپ نے خلیفہ کی تعیین ہی نہیں کی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو صحابہ سے یہ اطمینان نہیں تھا کہ میں تعیین کر دوں تو سب مان لیں گے۔ اسی لئے طارق جمیل صاحب کہتے ہیں ''تعیین کے بعد فرض کرو یہ سارے ہی مان جاتے''۔ یعنی آپ ﷺ کو قوی اندیشہ تھا تو یہی تھا کہ سب نہ مانیں گے۔ اور سب کے ماننے کو صرف فرض ہی کیا جا سکتا ہے۔

دوسری بحث

دفاع صحابہ

مولوی طارق جمیل صاحب کہتے ہیں۔

''دوسری بات یہ ہے کہ ہم شیعوں کے رد میں صحابہ کو بھی معصوم بنانے کے چکر میں پڑ جاتے ہیں ان کی خطا کی تاویل کرنا شروع کر دیتے ہیں تو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔بس یہ ایک آیت کافی ہے وکلا وعد اللہ الحسنٰی تاویل نہ کرو مانو خطا ہوئی ہے۔خطا کی تاویل کرنا تو کمزور راستہ ہے...... امیر معاویہؓ کے بارے میں جو کتاب لکھی مولانا تقی عثمانی صاحب نے وہ تاویل میں پڑے ہیں ہر جگہ۔کئی جگہ وہ تاویل بڑی کمزور ہے۔تو یہ تاویل کا راستہ صحیح نہیں ہے۔ ان کی براءت ہمارے ایمان کا حصہ ہے وہ حق تھے معصوم نہیں تھے انبیاء نہیں تھے محفوظ بھی نہیں تھے...... اللہ نے ان کو معاف کر دیا۔تو صحابہ کا دفاع یوں ٹھیک نہیں ہے کہ ان کی غلطیوں کی تاویل شروع کر دو۔''

ایک دوسری جگہ مولوی طارق جمیل صاحب کہتے ہیں۔

''بس یہ بات ذہن میں رکھو کہ علیؓ حق پر تھے اور معاویہؓ اس کے مقابلے میں خطا پر تھے...... خطا میں چونکہ بددیانتی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو صحیح سمجھ کے کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی خطا مغفور ہے بس۔اب ہمیں تاویل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ (کسی طالب علم نے سوال کیا کہ یہ اجتہادی غلطی تھی تو اس پر مولانا کا جواب تھا) ارے یہ تو سب ہمارے سابقے لاحقے ہیں خطا تھی۔''

ہم کہتے ہیں:

1- عجیب بات ہے کہ حضرت معاویہ ﷛ کی خطا کی تو مولوی طارق جمیل صاحب خود

تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں بددیانتی نہیں تھی بلکہ وہ اپنے آپ کو صحیح سمجھ کے کر رہے تھے جس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے ایسا کر رہے تھے کسی نفسانی خواہش یا طلب دنیا کی خاطر نہیں کر رہے تھے۔ ایسے میں جو خطا ہو وہ خطائے اجتہادی ہی تو کہلاتی ہے۔ لیکن مولوی طارق جمیل صاحب کو کچھ پتہ ہی نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں اور ایک طالب علم کے یہ کہنے پر کہ یہ اجتہادی غلطی تھی ان کو چاہئے تھا کہ کہتے کہ ہاں ٹھیک ہے اور اہلسنت کا موقف بھی یہی ہے اور اسی وجہ سے ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ان پر عیب لگائیں۔ اس کے بجائے انہوں نے اجتہادی کی قید کو ہمارے ساتھ لاحقے کہہ کر اس کی اہمیت ہی ختم کر دی اور ایک دوسرے طالب علم کے یہ کہنے پر کہ اس کا مطلب ہے کہ صحابہ دنیا کے طلبگار تھے یہ آیت پڑھ دی کہ **منکم من یرید الدنیا** اور اس طرح حضرت امیر معاویہ ؓ کی خطا کو بددیانتی اور طلب دنیا کے ساتھ ملا دیا۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

2- دوسری اہم بات یہ ہے کہ تاریخ میں یا حدیث کی کتابوں میں کچھ کبار یا نسبتاً زیادہ اہمیت والے صحابہ کے بارے میں بعض باتیں مجمل یا مبہم انداز میں ملتی ہیں جو بظاہر ان پر اعتراض کا باعث بنتی ہیں کہ وہ باتیں انہوں نے بددیانتی یا حماقت یا طلب دنیا میں کہی ہیں۔ خاص طور سے حضرت عثمان ؓ اور حضرت معاویہ ؓ پر ایسی روایات کی وجہ سے شیعوں نے اور مودودی صاحب نے بہت سے اعتراضات کئے ہیں۔ اب مولوی طارق جمیل صاحب تو یہ مت دیتے ہیں کہ ان اعتراضوں کا جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں بس تسلیم کر لو کہ ان صحابہ نے غلطیاں کی ہیں البتہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا ہے اور ان سے آخرت میں اچھا وعدہ فرمایا ہے۔ مولوی صاحب کی یہ روش انتہائی غیر معقول ہے۔ صحابہ پر کوئی بھی انگلی اٹھا دے۔ طارق جمیل صاحب کی ہدایت ہے کہ بس صحابہ کی غلطی مان لو خواہ حقیقت میں وہ غلطی ہو یا نہ ہو۔

دیگر علماء کی قرون اولی سے یہ روش رہی ہے کہ جو صحابہ کی واقعی غلطی نہیں تھی اس میں ان کا دفاع کرتے تھے اور روایت کے ظاہری مطلب سے ہٹا کر صحیح بات بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اسی عمل کو تاویل کرنا کہتے ہیں اور اسی کو دفاع صحابہ بھی کہتے ہیں۔ دیکھئے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ بھی حضرت عثمان ؓ کا دفاع کرتے ہیں۔

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَوْهَبٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ مِصْرَ يُرِيْدُ حَجَّ الْبَيْتِ فَرَأَى قَوْمًا جُلُوْسًا فَقَالَ مَنْ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمُ قَالُوْا هٰؤُلَاءِ قُرَيْشٌ قَالَ فَمَنِ الشَّيْخُ فِيْهِمْ قَالُوْا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ قَالَ يَا ابْنَ عُمَرَ اِنِّي سَائِلُكَ عَنْ شَيْءٍ فَحَدِّثْنِيْ هَلْ تَعْلَمُ أَنَّ عُثْمَانَ فَرَّ يَوْمَ أُحُدٍ قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ تَعْلَمُ اَنَّهٗ تَغَيَّبَ عَنْ بَدْرٍ وَلَمْ يَشْهَدْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ تَعْلَمُ اَنَّهٗ تَغَيَّبَ عَنْ بَيْعَةِ الرِّضْوَانِ فَلَمْ يَشْهَدْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَللّٰهُ اَكْبَرُ قَالَ ابْنُ عُمَرَ تَعَالَ أُبَيِّنْ لَكَ أَمَّا فِرَارُهٗ يَوْمَ أُحُدٍ فَأَشْهَدُ أَنَّ اللّٰهَ عَفَا عَنْهُ وَ وَأَمَّا تَغَيُّبُهٗ عَنْ بَدْرٍ فَاِنَّهٗ كَانَتْ تَحْتَهٗ رُقَيَّةُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَكَانَتْ مَرِيْضَةً فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ لَكَ أَجْرَ رَجُلٍ مِمَّنْ شَهِدَ بَدْرًا وَسَهْمَهٗ وَأَمَّا تَغَيُّبُهٗ عَنْ بَيْعَةِ الرِّضْوَانِ فَلَوْ كَانَ أَحَدٌ أَعَزَّ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ عُثْمَانَ لَبَعَثَهٗ فَبَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عُثْمَانَ وَكَانَتْ بَيْعَةُ الرِّضْوَانِ بَعْدَ مَا ذَهَبَ عُثْمَانُ اِلٰى مَكَّةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدِهِ الْيُمْنٰى هٰذِهٖ يَدُ عُثْمَانَ فَضَرَبَ بِهَا عَلٰى يَدِهٖ وَقَالَ هٰذِهٖ لِعُثْمَانَ ثُمَّ قَالَ ابْنُ عُمَرَ اِذْهَبْ بِهَا الْآنَ مَعَكَ. (بخاری)

حضرت عثمان بن عبداللہ بن موہب کہتے ہیں اہل مصر کا ایک شخص حج بیت اللہ کے ارادہ سے (مکہ مکرمہ) آیا۔ یہاں اس نے (ایک جگہ) کچھ لوگوں کو (اکٹھے) بیٹھے دیکھا تو پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ خاندان قریش کے (بڑے) لوگ ہیں۔ اس نے پوچھا ان میں بڑے عالم کون ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ (وہ شخص حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا اور) اس نے کہا اے ابن عمر مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے تو آپ مجھے جواب دیجئے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ جنگ احد کے موقع پر (جب مشرکین کی فوج نے پہاڑی کے پیچھے سے پلٹ کر حملہ کیا تھا تو) عثمان فرار ہو گئے تھے۔ انہوں نے جواب دیا ہاں (ایسا ہی تھا)۔ اس شخص نے پوچھا کیا آپ جانتے ہیں کہ عثمان جنگ بدر سے غائب رہے تھے اور اس میں حاضر نہ ہوئے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں (ایسا ہی تھا)۔ اس شخص نے پوچھا کیا آپ جانتے ہیں کہ عثمان بیعت رضوان سے بھی غائب رہے تھے اور اس میں شریک نہ تھے۔ انہوں نے جواب دیا ہاں (ایسا ہی تھا)۔ اس شخص نے (یہ سمجھا کہ ہم جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف الزام لگاتے ہیں ان کی تائید و تصدیق حضرت عبداللہ بن

عمر ﷺ نے بھی کر دی ہے اور اس سے اب لوگ لاجواب ہو جائیں گے اور یہ ہمیں بڑی کامیابی حاصل ہوگئی ہے اس لئے اس نے خوشی سے) اللہ اکبر کہا۔ اب حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ نے فرمایا ذرا میرے قریب آ جاؤ (اور اپنی ان باتوں کی تفصیل بھی سن لو جو) میں تمہارے لئے بیان کرتا ہوں۔ رہا عثمان کا جنگ احد سے فرار تو (اس وقت اچانک حملہ سے بہت سے صحابہ کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اگر چہ بعد میں وہ سنبھل گئے اور پلٹ آئے لیکن اصل بات کی) میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما چکے ہیں (اور یہ معافی قرآن پاک کے اندر موجود ہے تو معافی کے بعد عیب لگانا کیسے جائز ہے؟)

رہی جنگ بدر سے ان کی غیر حاضری تو بات یہ ہے کہ ان کے نکاح میں رسول اللہ ﷺ کی بیٹی رقیہؓ تھیں جو اس وقت بیمار تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے (عثمان کو ان کی دیکھ بھال کرنے کو کہا تھا اور ان کو جو یہ خیال ہوا کہ میں جہاد میں شرکت سے محروم رہوں گا تو آپ ﷺ نے خود) ان سے فرمایا کہ تمہیں جنگ بدر میں شریک ہونے والے کا ثواب ملے گا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آپ ﷺ نے) ان کو مال غنیمت میں سے (برابر کا) حصہ بھی دیا۔

رہی بیعت رضوان میں ان کی عدم شرکت تو اگر (رشتہ داری کے اعتبار سے) مکہ مکرمہ میں کوئی دوسرا صحابی ان سے زیادہ عزت دار ہوتا تو آپ ﷺ ان کو (مشرکین سے گفتگو کے لیے مکہ) بھیجتے۔ (چونکہ ایسا کوئی نہ تھا تو رسول اللہ ﷺ نے عثمان ﷺ کو مکہ مکرمہ بھیجا اور بیعت رضوان تو ان کے مکہ جانے کے بعد ہوئی (جس کی وجہ یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ مشرکین نے حضرت عثمان ﷺ کو قتل کر دیا ہے اور مسلمانوں سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں) تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے داہنے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور وہ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھا اور فرمایا یہ (بیعت) عثمان کے لئے ہے۔ پھر حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ نے فرمایا لو اب یہ ساری باتیں اپنے ساتھ لے جاؤ (اور یہ بھی ساتھ میں بتاؤ)۔

اب کسی کی تاویل اور دفاع کو کمزور دیکھ کر مولوی طارق جمیل صاحب کو چاہئے تھا کہ وہ زیادہ موثر دفاع کی سوچتے لیکن انہوں نے تو بے حمیتی کا سبق دینا شروع کر دیا کہ دشمنوں اور دوست نما دشمنوں کی تنقیدوں اور اعتراضوں کو سنو اور تسلیم کر لو اس کی کوئی تاویل اور دفاع نہ کرو۔ سلف صالحین نے تو ہمیں اس سے بہت مختلف سبق سکھایا ہے۔

تیسری بحث

مولوی طارق جمیل صاحب اور جہاد

مولوی طارق جمیل صاحب کہتے ہیں:

''پچھلی صدی میں جتنی بھی تحریکیں اٹھیں یا اہل خیر لیڈر اس میں مخلص بھی تھے...... وہ سب کے سب قوت کے زمانے کے واقعات کو دلیل بنا کر ٹکرانے کے لئے چل پڑے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں شاملی میں مشورہ ہوا تو سب کی رائے تھی کہ قتال کرنا ہے۔ ایک بڑے عالم تھے ان کا نام ہے شیخ محمد۔ وہ کہنے لگے کہ ہم کمزور ہیں اور اس کمزوری میں یہ حکم نہیں ہے۔ تو حضرت نانوتوی نے کہا کہ کیا ہم بدر سے بھی زیادہ کمزور ہیں؟ تو اس پر وہ خاموش ہو گئے چپ ہو گئے پھر شاملی میں جنگ ہوئی...... اس میں حافظ ضامن صاحب شہید ہوئے...... اور حضرت گنگوہی زخمی ہوئے۔ پھر یہ سارے حضرات مفرور ہو گئے اور جو مولانا حاجی امداد اللہ صاحب تھے وہ ہجرت کر کے مکہ چلے گئے چھپتے چھپاتے چھپتے چھپاتے...... پھر انہوں نے وہی کیا جو مولانا شیخ محمد کہہ رہے تھے پیچھے ہٹ گئے پھر مدرسے پر آ گئے...... قوت کے واقعات کو سامنے رکھ کر...... اور ان واقعات سے استدلال پکڑ کر کام کرتے رہے...... نتیجہ یہ ہوا کہ مخلصین کی طاقتیں لگتی رہیں شہید بھی ہوئے، قید بھی ہوئے لیکن جس مقصد کے لئے اٹھے تھے اس مقصد تک نہ پہنچ سکے اللہ تعالی کی طرف سے مولانا الیاس رحمہ اللہ کو الہامی طور پر یہ چیز دی گئی...... اللہ کی طرف سے الہامی طور پر یہ بات سامنے آئی (کہ) ہم کمزور ہیں اور کمزور کے احکام اور ہوتے ہیں۔ تو حدیبیہ میں اس کی دلیل ہے کہ پیچھے ہٹ جاؤ اور صبر کر جاؤ...... جب کفار آ کر ارض المسلم پر قبضہ کر لیں ایک شہر پر...... لکھا ہوا ہے ٹھیک لکھا ہوا ہے...... ایک شہر پر بھی قبضہ کر لیں

تو تمام امت پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے...... لیکن فرض عین ہوتا ہے استعداد کے ساتھ۔ استعداد نہیں تو ساقط ہو جاتا ہے...... تو افغانستان کی مثال دیتے ہیں آج کہ افغانستان پر قبضہ ہو گیا عراق پر قبضہ ہو گیا عراق پر قبضہ ہو گیا ساری امت پر فرض عین ہے...... اس میں کوئی شک نہیں لیکن یہ فرض عین اپنی شرط کے ساتھ ہے۔ فرض عین ہے تو ساتھ استعداد بھی ہو، استعداد نہیں تو پھر صبر کرنا پڑے گا...... عزالدین بن عبدالسلامؒ نے کتاب لکھی ہے...... قواعد الاحکام فی مصالح الانام...... تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر اعلائے کلمۃ اللہ کا تحقق نہ ہو رہا ہو تو قتال ویسے ہی ساقط ہے صرف شہادت مطلوب نہیں ہے مطلوب کسی غرض کے ساتھ ہے۔" ایوین نہیں (یعنی فضول) جان گنوا دینے کا حکم (نہیں ہے)۔"

ہم کہتے ہیں:

مولوی طارق جمیل صاحب نے اس مقام پر بھی کئی غلطیاں کی ہیں:

1۔ اگر جنگ شاملی میں شیخ محمد تھانویؒ کا وہی اعتراض مان لیا جائے جو مولوی طارق جمیل نے کہا ہے تب بھی مولانا نانوتویؒ کے جواب پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور یہ بات بھی غور کا تقاضا کرتی ہے کہ مولانا گنگوہیؒ بھی جنگ میں شریک ہوئے اور زخمی بھی ہوئے۔ معلوم ہوا کہ جہاد کی استعداد ہے یا نہیں یہ ایک امر اجتہادی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کی نظر میں استعداد موجود ہو اور دوسرے کی نظر میں نہ ہو...... شیخ محمد کی نظر میں استعداد موجود نہ تھی جب کہ مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی کی نظروں میں موجود تھی اور ہر ایک نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا۔ شاملی کی جنگ میں بالآخر شکست کے بعد جب وہ استعداد بھی باقی نہ رہی تو مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی نے براہ راست تصادم کی راہ چھوڑ دی اور مدرسہ کی لائن اختیار کی۔

2۔ مولوی طارق جمیل صاحب نے جہاد کے فرض عین ہونے والی بات کو ذکر کیا ہے فرض کفایہ ہونے کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ بظاہر یہ ہے کہ مولوی طارق جمیل صاحب کے نزدیک استعداد نہ ہونے پر نہ تو جہاد فرض عین ہے اور نہ فرض کفایہ ہے۔ اور عز بن عبدالسلامؒ کے قول سے مولوی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ جہاد کے نام سے جو کوششیں ہو رہی ہیں چونکہ ان سے

اعلائے کلمۃ اللہ کا تحقق نہیں ہو رہا اور جہاد کی غرض پوری نہیں ہو رہی اس لئے جہاد وقتال ساقط ہے اور چونکہ غرض حاصل ہونے کے آثار بھی موجود نہیں ہیں کیونکہ اتنی طاقت نہیں ہے اس لیے جو لوگ جہاد کے نام پر اپنی جانیں دے رہے ہیں وہ فضول میں دے رہے ہیں کیونکہ غرض کے بغیر شہادت مطلوب شرعی نہیں بنتی۔

مولوی طارق جمیل صاحب کے ذکر کردہ فلسفہ کو مان لیا جائے تو موجودہ دور میں پوری دنیا کے مسلمانوں کے پاس جہاد وقتال کرنے کی طاقت واستعداد تو ہے نہیں۔ لہٰذا ان کو جہاد نہیں کرنا چاہئے اور موجودہ دور جہاد وقتال سے خالی رہنا چاہئے جب کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔

لا تزال طائفة من امتي يقاتلون علي الحق ظاهرين الي يوم القيامة. (بخاری و مسلم)

میری امت کا ایک حصہ حق کی خاطر لڑتا رہے گا قیامت کے دن تک ظاہر (و باہر اور غالب) رہے گا (یہ نہیں کہ جہاد کرنے والوں کا سلسلہ شکست کھا کر بالکل ختم ہی ہو جائے اور بیٹھ رہے)۔

اب بتائیے حدیث میں ایک خبر ہے جس کے مطابق بظاہر استعداد نہ ہونے کی حالت میں یعنی موجودہ دور میں بھی لوگ حق پر قتال کریں گے اور وہ کیا ہی قابل تعریف لوگ ہوں گے جو حق کے لئے جانیں دے رہے ہوں گے اگرچہ مقصد حاصل نہ ہو۔ اور اگر اس حدیث کو انشاء کے معنی میں بھی لیں تب بھی اس کا تقاضا یہی ہے کہ ہر دور میں جہاد ہوتا رہے۔ لیکن مولوی طارق جمیل صاحب کو ان سب حقائق سے کیا غرض ہے ان کے فتوے کی رو سے تو یہ سب لوگ فضول جانیں دے رہے ہیں اور جہاد کا نام بدنام کر رہے ہیں۔

3- مولوی طارق جمیل صاحب کی یہ بات ان پر عزیمت حضرات پر طعنہ زنی ہے جو عراق، افغانستان اور فلسطین میں مقاومت و جہاد اختیار کئے ہوئے ہیں اور جانی و مالی قربانیاں دے رہے ہیں۔ وہ خود قربانیاں دے رہے ہیں اور کافروں کی اتحادی قوتوں کو چین نہیں لینے دے رہے۔ وہ مولوی طارق جمیل صاحب پر جہاد میں تشکیل کرانے پر تو زور نہیں دے رہے پھر مولوی صاحب کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی جماعت کی پالیسیوں سے تجاوز کر کے دوسروں کو تنقید کا نشانہ بنائیں۔

4- مولوی طارق جمیل صاحب نے یہ کہہ کر کہ ''جس مقصد کے لیے اٹھے تھے اس مقصد تک نہ پہنچ سکے'' یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے جہاد اسی وقت ہے جب مقصد تک پہنچنا نصیب بھی ہو۔ یہ بالکل غلط بات ہے کیونکہ مقصد کو حاصل کر لینا تو انسان کے اختیار کی چیز نہیں ہے۔انسان کا کام ہے تبلیغ کرنا اور جہاد کرنا رہا مقصد کا حصول تو وہ اللہ کی تکوین سے ہوتا ہے۔

5- مولوی طارق جمیل صاحب کہتے ہیں۔

''اللہ کی طرف سے الہامی طور پر یہ بات سامنے آئی۔ہم کمزور ہیں کمزور کے احکام اور ہوتے ہیں۔حدیبیہ میں اس کی دلیل ہے کہ پیچھے ہٹ جاؤ صبر کر جاؤ۔''

مولوی طارق جمیل صاحب خلط مبحث خوب کرتے ہیں۔ بھلا بتائیے کہ جو مسلمان بدر و احد اور جنگ احزاب میں قریش سے دو دو ہاتھ کر چکے تھے اور جنگ احزاب میں رسول اللہ ﷺ یہ فرما چکے تھے کہ اب آئندہ ہم کفار پر چڑھائی کریں گے وہ ہم پر چڑھ کر نہ آسکیں گے تو کیا وہ مسلمان کمزور تھے؟ اور جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ حضرت عثمان ؓ قتل کر دیئے گئے ہیں تو اس وقت رسول اللہ ﷺ نے اس خیال سے کہ شاید لڑائی کا موقع آ جائے سب صحابہ سے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر جہاد کی بیعت لی۔ جب قریش نے بیعت کی خبر سنی تو ڈر گئے اور حضرت عثمان ؓ کو واپس بھیج دیا۔ (تفسیر عثمانی) تو کیا یہ لوگ کمزور تھے اور لڑائی کی استعداد نہ رکھتے تھے؟ پھر مکہ کے سردار خود صلح کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ کیا صلح کے لئے کوئی کسی کمزور کے پاس بھی جاتا ہے؟ مزید بریں حدیبیہ کی صلح بظاہر ذلت و مغلوبیت کی صلح نظر آتی ہے اور صلح کی شرائط پڑھ کر بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ تمام جھگڑوں کا فیصلہ کفار قریش کے حق میں ہوا۔ چنانچہ حضرت عمر اور دوسرے صحابہ ؓ بھی صلح کی ظاہری سطح دیکھ کر سخت محزون و مضطرب تھے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ اسلام کے چودہ پندرہ سو سرفروش سپاہیوں کے سامنے قریش اور ان کے طرفداروں کی جمعیت کیا چیز ہے کیوں تمام نزاعات کا فیصلہ تلوار سے نہیں کر دیا جاتا (تفسیر عثمانی) کیا ان حضرات کا اضطراب محض ہوائی جوش تھا اور ان کو اپنی استعداد کا اندازہ کرنے میں غلطی لگ رہی تھی؟ مولوی طارق جمیل صاحب کو چاہئے کہ ہوش کے ناخن لیں۔

حدیبیہ کی صلح تو اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے قبول کی کہ آپ کی آنکھیں ان احوال و نتائج کو دیکھ رہی تھیں۔ جو دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل تھے......آپ بے مثال استغناء اور

توکل وتحمل کے ساتھ ان کی ہر شرط قبول فرماتے رہے اور اپنے اصحاب کو اللہ ورسولہ اعلم کہہ کر تسلی دیتے رہے یعنی اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے تا آنکہ یہ سورت نازل ہوئی اور خداوند قدوس نے اس صلح اور فیصلہ کا نام فتح مبین رکھا...... حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کی بیعت جہاد اور معمولی چھیڑ چھاڑ کے بعد کفار معاندین کا مرعوب ہوکر صلح کی طرف جھکنا اور نبی کریم ﷺ کا باوجود جنگ اور انتقام پر کافی قدرت رکھنے کے ہر موقع پر اغماض اور درگزر سے کام لینا اور محض تعظیم بیت اللہ کی خاطر ان کے بے ہودہ مطالبات پر قطعاً برافروختہ نہ ہونا یہ واقعات ایک طرف اللہ کی خصوصی مدد ورحمت کے استجلاب کا ذریعہ بنتے تھے اور دوسری جانب دشمنوں کے قلوب پر اسلام کی اخلاقی اور روحانی طاقت اور پیغمبر علیہ السلام کی شان پیغمبری کا سکہ بٹھا رہے تھے۔ (تفسیر عثمانی)۔

کہاں صلح حدیبیہ کی یہ وجوہات اور کہاں مولوی طارق جمیل صاحب کی کوتاہ چشمی فیا للعجب۔

چوتھی بحث

مولوی طارق جمیل صاحب اور دعوت و تبلیغ کی شرعی حیثیت

مولوی طارق جمیل صاحب کہتے ہیں۔

''ایک اور نسبت ہمیں اپنے محبوب ﷺ سے وہ ختم نبوت کی ہے.......

تبلیغ کا کام ہمیں لا نبی بعدی سے مل رہا ہے.......

تبلیغ کا کام منیٰ کی وادی سے آیا ہے.......

اس کام کے لئے پہلے نبیوں کو چنا، اب ہمیں چنا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کا مجمع ہے منیٰ کی وادی ہے......جس کے خطبے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا **فلیبلغ الشاهد الغائب**

شاہد غائب تک پہنچا دیں۔ آپ ﷺ کہتے میرا پیغام عالم غائب تک پہنچا دیں تو تبلیغ پھر صرف علماء کا کام ہوتا...... اگر اللہ تعالیٰ کا رسول کہتا **فلیبلغ العامل الغائب** (عمل کرنے والے تبلیغ کریں)......تو......کوئی بڑے بڑے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے اور مجدد الف ثانیؒ جیسے...... اور معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ جیسے اور علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ جیسے فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ جیسے ایسے اللہ کے نیک پاک لوگ تبلیغ کرتے اور ہماری چھٹی ہوتی لیکن اللہ کے نبی ﷺ نے نہ تو یہ کہا کہ **فلیبلغ العالم** نہ یہ کہا کہ **فلیبلغ العامل**۔

اللہ کے نبی ﷺ نے کہا **فلیبلغ الشاهد الغائب** ۔شاہد کا کیا مطلب ہے میں نے لسان العرب دیکھی......اس دن پڑھ کے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اللہ کے نبی ﷺ نے شاہد کیوں کہا ہے کہ لفظ شاہد اپنے معنی میں اتنا وسیع ہے کہ اس لفظ نے امت کے کسی فرد کو کسی طبقے کو اور کسی خطے میں رہنے والے کو نہیں چھوڑا۔ امت کے تمام

افراد اور تمام طبقات تمام قوموں والے تمام زبانوں والوں کو اس لفظ نے باندھ دیا کہ امت کا ہر مسلمان مرد و عورت وہ اللہ کا پیغام آگے پہنچانے والا ہے۔" (بیانات جمیل ج اول ص120-118)

اسی بات کو مولانا جمشید صاحب نے اپنی ایک تحریر میں یوں لکھا ہے۔

"حدیث من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ (جو کوئی تم میں سے کوئی برائی ہوتے دیکھے تو اس کو اپنی قوت بازو سے روک دے) میں امت کا ہر ہر فرد مخاطب ہے کسی قسم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اسی طرح منکر مع التنوین بھی عام ہے کوئی بھی منکر ہو ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے اور وہ اس کے تغیر میں لگنے کا مامور ہے اور اپنی قوت بازو سے اس کے بدلنے کا مکلّف ہے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو پھر اس سے کمتر درجہ زبان سے کہنے کا اور اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا سمجھنے کا ہے۔ اسی طریقہ پر بلغوا عنی ولو آیۃ میں ہر ہر امتی اس تبلیغ کا مکلّف ہے آپ ﷺ نے صراحت کے ساتھ اپنی ذمہ داری بطور امانت امت کی طرف منتقل فرمائی اور ہر ہر امتی کو مکلّف فرما دیا۔"

ہم کہتے ہیں کہ ان حضرات کا کلام دو باتوں پر مشتمل ہے۔

1- امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت و تبلیغ کے کام کا ہر امتی مکلّف ہے خواہ مرد ہو یا عورت ہو۔

2- امت کے افراد کی یہ ذمہ داری ختم نبوت کی بناء پر ہے۔ دوسرے لفظوں میں ختم نبوت کی بناء پر یہ امت نیابت نبوت کے لئے مبعوث ہوئی ہے۔ اور منتخب کی گئی ہے۔

ان دونوں باتوں پر گفتگو کرنے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت و تبلیغ کی حقیقت کو واضح کر دیا جائے۔ لیکن مندرجہ ذیل تنبیہ کو پیش نظر رکھئے۔

تنبیہ: ہم سمجھتے ہیں کہ دعوت و تبلیغ ہماری ضرورت ہے، پوری انسانیت کی ضرورت ہے اور ہمارے دین کا اہم شعبہ ہے اس لئے دعوت و تبلیغ کا کام چلتے رہنا چاہئے اس کی شرعی حیثیت کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس بحث کو خود مولوی طارق جمیل صاحب اور رائے ونڈ کے دوسرے حضرات نے چھیڑا ہے۔ ہم نے ان حضرات کے غلو کرنے کی وجہ

سے بادل ناخواستہ اس بحث میں حصہ لیا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی حقیقت

دین میں جن کاموں کے کرنے کو کہا گیا ہے اور وہ اللہ تعالی کے ہاں پسندیدہ ہیں ان کو معروف یعنی نیکی کہا جاتا ہے اور جو کام ایسے ہیں جن کا کرنا دین میں منع ہے ان کو منکر یعنی برائی کہا جاتا ہے۔ معروف میں فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات سب داخل ہیں اور منکر میں حرام اور مکروہ سب داخل ہیں۔

کسی دوسرے کو نیکی کے کام کی تلقین کرنے کو امر بالمعروف کہتے ہیں اور دوسرے کو برائی کے کام سے روکنے کو نہی عن المنکر کہتے ہیں۔

جب کوئی شخص کسی منکر اور برائی کو ہوتا دیکھے تو اس پر لازم اور فرض ہے کہ وہ اس کو اولاً (زبان سے روکے اور نہ مانے تو) اپنی قوت بازو سے روک دے مثلاً کسی کو شراب پیتے دیکھا تو اس سے شراب چھین کر بہادے کسی کو موسیقی سنتے دیکھا تو موسیقی کے آلات توڑ دے۔ اسی طرح اور برائیوں کو ان کے طریقے سے روک دے۔ حکمران اور اصحاب اختیار اپنی رعایا اور اپنے ماتحتوں کو اور والد اپنی اولاد کو اپنی قوت بازو سے برائیوں سے روک سکتے ہیں۔

اگر برائی کرنے والا مثلاً زیادہ قوی ہو اور دیکھنے والا اپنی قوت بازو سے برائی سے اس کو نہ روک سکتا ہو تو اپنے قول سے یعنی اس کو وعظ ونصیحت کر کے اور اس کو اس گناہ پر وعید سنا کر اس برائی اور گناہ سے روکنے کی کوشش کرے اور اگر اتنی بھی قدرت نہ ہو اور یہ ڈر ہو کہ زبان سے منع کرنے پر بھی برائی والا اس کو شدید نقصان یا تکلیف پہنچائے گا تو کم از کم دل میں برا سمجھے۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے دوسرے کو فرائض وواجبات ترک کرتے دیکھا تو اس پر لازم ہے کہ ترک کرنے والے کو امر بالمعروف یعنی نیکی کی تلقین کرے۔ یہ فریضہ بھی ہر شخص کی قدرت وطاقت کے مطابق ہوگا مثلاً کوئی شخص فرض نماز ترک کرتا ہے تو اصحاب حکومت و اختیار اس کو قید کر سکتے ہیں اور دیگر اصحاب اختیار بھی اپنے ماتحتوں کو مجبور کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی مجبور نہیں کر سکتا اور اس کو نصیحت کر سکتا ہے تو نصیحت ہی کرے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو اس کی نیکی کے ترک کو دل سے برا سمجھے۔

امر بالمعروف اور دعوت وتبلیغ میں فرق

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعلق فوری عمل سے ہوتا ہے یعنی کسی کو فرض نماز چھوڑتے دیکھا تو امر بالمعروف یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ وہ اس وقت کی نماز پڑھے اور شراب پیتے دیکھا تو نہی عن المنکر یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ وہ اسی وقت شراب چھوڑ دے اور مزید نہ پئے۔ آئندہ کسی وقت توبہ کرنے کے لئے جو وعظ ونصیحت کی جائے اس کو دعوت و تبلیغ کہتے ہیں۔

فوری عمل اور فوری اثر کے لئے جو اقدام کیا جائے وہ حقیقت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کہلاتا ہے لیکن کبھی دعوت وتبلیغ کو بھی قرآن وحدیث میں مجازا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کہا گیا ہے جیسا کہ آگے مثال میں ذکر ہوگا۔

دعوت وتبلیغ کی حقیقت

امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے ہٹ کر ایک اور شعبہ دعوت الی الخیر یعنی قرآن وسنت کی اتباع کی دعوت دینے کا ہے۔ یہ دعوت کافروں کو بھی ہے اور مسلمانوں کو بھی ہے۔ مسلمانوں کو دین کے عقائد اور احکام و اخلاق کی دعوت ہے اور کافروں کو اسلام و ایمان کی دعوت ہے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں ایک تعداد ایسے لوگوں کی ہو جو دعوت وارشاد کے کام کے لئے ہو اور اس کا وظیفہ ہی یہ ہو وہ اپنے قول وعمل سے دنیا کو قرآن سنت کی طرف بلائیں اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست یا برائی میں مبتلا دیکھیں تو اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور برائی سے روکنے میں اپنی قدرت کے موافق کوتاہی نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو معروف ومنکر کا علم رکھتے اور قرآن وسنت سے باخبر ہونے کے ساتھ ساتھ ذی ہوش اور موقع شناس ہوں اور یہ وہی ہو سکتے ہیں جو علماء حق ہوں متبع سنت ہوں، شرک و بدعت سے دور ہوں اور دین کے اصول وفروع سے کما حقہ باخبر ہوں اور نفس کی شرارتوں سے بچتے ہوں۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ ایک جاہل آدمی معروف کو منکر یا منکر کو معروف خیال کر کے بجائے اصلاح کے سارا نظام ہی مختل کر دے یا ایک منکر کی اصلاح کا ایسا طریقہ

اختیار کرے جو اس سے بھی زیادہ منکرات کا سبب بن جائے یا نرمی کی جگہ سختی اور سختی کے موقع میں نرمی برتنے لگے۔ (تفسیر عثمانی ص 81)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور دعوت وتبلیغ کا دائرہ کار

امر بالمعروف ونہی عن المنکر جب کہ ان کا حقیقی معنی مراد ہو ان کا دائرہ دعوت وتبلیغ سے زیادہ وسیع ہے۔ عام فرائض و واجبات اور عام ممنوعات جن سے عام طور سے تمام مسلمان واقف ہوتے ہیں، عوام بھی از خود ان کی تلقین کر سکتے ہیں لیکن دعوت وتبلیغ اصلا اہل علم کا کام ہے البتہ وہ عوام کو ضروری تعلیم وتربیت دے کر ان سے بھی دعوت وتبلیغ کا کام لے سکتے ہیں۔

1- دعوت تبلیغ کی شرعی حیثیت

قرآن پاک میں ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَي الْخَيْرِ وَ يَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.

(آل عمران: 104)

''اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کرے برائی سے''۔

اس آیت میں واضح طور سے فرمایا کہ دعوت کا کام مسلمانوں کی ایک جماعت کے ذمہ ہے اور اس جماعت سے مراد وہ حضرات ہیں جن کو قرآن وسنت کا پختہ علم حاصل ہو ہر ہر شخص کا یہ کام نہیں۔

ایک حدیث یہ ہے۔

عَنِ ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ من آمن بالله و رسوله و اقام الصلاة و صام رمضان کان حقا علی الله ان یدخله الجنة جاهد فی سبیل الله او جلس فی ارضه التی ولد فیها. (بخاری).

حضرت ابو ہریرہ﷜ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھا اور نماز قائم کی اور رمضان کے روزے رکھے تو اللہ پر حق ہے کہ اس کو جنت میں داخل کرے خواہ اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو یا وہ اپنی اسی جگہ پر ٹکا رہا ہو

جہاں وہ پیدا ہوا۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جہاد ہو یا دعوت کا کام ہو ہر ہر امتی پر یہ فرض نہیں ہے کیونکہ جب وہ اپنی بستی ہی میں بیٹھا رہا تو اس نے دوسروں تک دین پہنچانے کی فکر بھی نہیں کی۔ اگر یہ اس پر بھی فرض ہوتا جیسا کہ نماز روزہ ہر امتی پر فرض ہیں تو اس کے نہ کرنے پر گرفت کا اندیشہ ہونا چاہئے تھا۔

ایک اور آیت ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ.

''آپ کہہ دیجئے یہ میری راہ ہے۔ بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جس نے میری پیروی کی۔''

اس آیت کا یہ مطلب لیا جائے کہ جو میری پیروی کرنے والے ہیں وہ بھی (اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہیں) تو اس سے بھی ہر ہر امتی کا مکلف ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک خبر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے پکے پیروکار دعوت کا کام کرتے ہیں۔ اور اگر یہ مطلب لیں کہ آپ کا ہر ہر پیروکار دعوت کا کام کرتا ہے تو یہ خبر خلاف واقعہ ٹھہرتی ہے کیونکہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد دعوت کا کام نہیں کرتی حالانکہ قرآن کی خبر تو غلط نہیں ہوسکتی لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں خاص قسم کے پیروکار مراد ہیں جو قرآن و سنت کا وافر علم رکھتے ہیں اور ان کو بصیرت بھی حاصل ہے۔ ہر ہر مسلمان مراد نہیں ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.

چونکہ اس آیت میں امت مسلمہ سے خطاب ہے اور بتایا گیا کہ وہ لوگوں کے نفع کے لئے نکالی گئی ہے تو یہاں الناس سے وہ لوگ مراد ہیں جو ابھی تک ملت کفر میں ہیں اور یہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ایمانیات کو اختیار کرنے اور کفریات کو ترک کرنے کی تلقین مراد ہے۔ غرض یہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد دعوت وتبلیغ ہے۔

اس آیت میں بھی امت مسلمہ مجموعی طور پر مراد ہے اس کا ہر ہر فرد مراد نہیں ہے کیونکہ یہاں خیر امت ہونے کی خبر دی گئی ہے اگر ہر ہر فرد کے خیر اور بہترین ہونے کا مطلب لیں تو مشاہدہ اس کے خلاف ہے اور چونکہ قرآن کی خبر تو غلط نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا امت کو بحیثیت مجموعی

مراد لینا ضروری ہوگا۔

حدیث میں ہے بلغوا عنی ولو آیۃ (میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو)۔

اوپر ذکر کئے گئے قرآن وحدیث کے دلائل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دعوت وتبلیغ کا کام امت کے ہر ہر فرد کے ذمہ نہیں ہے لہٰذا ان کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اہل علم کے ذمہ ہے کہ وہ تبلیغ کریں۔

حدیث فلیبلغ الشاھد الغائب کا مطلب ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جو لوگ موجود ہیں وہ غیر موجود لوگوں تک رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کو پہنچا دیں۔ ایسے خطاب میں بھی اہل علم اور اہل فہم مراد ہوتے ہیں ہر ہر شخص مراد نہیں ہوتا کیونکہ اگر الشاہد میں لام تعریف سے استیعاب مراد لیں تو اول تو صرف حجۃ الوداع کے حاضرین مراد ہوں گے پورے عالم کے مسلمان مراد نہیں ہوں گے۔ دوسرے الغائب میں لام تعریف سے صرف دوسرے تمام مسلمان مراد ہیں یا تمام عالم کے انسان مراد ہیں۔ اگر تمام مسلمان مراد ہوں تو ہر ایک شاہد نے کیا ہر ایک غائب کو جا کر تبلیغ کی۔ ایسا یقیناً نہیں ہوا۔ اور نہ ہی اس کا اہتمام والتزام کرنا منقول ہے کہ ہر ایک شاہد ہر ایک مختلف غائب کو جا کر بتائے گا۔ اور اگر کیا بھی ہو تو کیا اس سے ہر ایک غائب تک بات پہنچ گئی تھی۔

علاوہ ازیں جو چیز ہر ہر امتی پر فرض ہو وہ تو امور بدیہیہ میں سے ہوتی ہے جیسے نماز اور روزہ وغیرہ حالانکہ تبلیغ کا ہر امتی پر فرض ہونا امر بدیہی نہیں ہے بلکہ عام طور سے علماء کو بھی تسلیم نہیں ہے۔ پھر اس کو ماننے سے بڑی خرابیاں لازم آتی ہیں۔ مثلاً:

i- مولانا سعید خان صاحب کے کہے کے مطابق دعوت کے کام کو چھوڑے ہوئے تیرہ سو سال ہو گئے۔ اس کے مطابق تو کچھ صحابہ، بہت سے تابعین اور سارے ہی تبع تابعین سمیت امت کا ایک بڑا حصہ فرض عین کا تارک اور گناہگار ہی ہوا۔

ii- ہر ہر امتی پر تبلیغ فرض ہو تو ظاہر ہے کہ سب تو رائے ونڈ جا کر تبلیغ کے اسلوب کو نہیں سیکھیں گے لہٰذا بہت سے جاہل اور ناقص تبلیغ کریں گے تو دین کو فائدہ دینے کے بجائے دین کو نقصان پہنچائیں گے جیسا کہ عام مشاہدہ ہے۔

تنبیہ 1: دعوت وتبلیغ کا کام اگر ہر ہر امتی کے ذمہ ہو یعنی ہر ایک پر فرض ہونے کو تسلیم

کرلیا جائے تو پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ اس کی کتنی مقدار ہے جس کو ادا کرنے سے وہ بری الذمہ ہو سکے۔ جہاد جب فرض عین ہوتا ہے تو آدمی کو اپنا سب کچھ چھوڑ کر نکلنا ہوتا ہے تو کیا تبلیغ کے لئے بھی اپنا گھر بار اور کاروبار سب کچھ چھوڑے گا؟

تنبیہ 2: یہ اعتراض بھی بنے گا کہ جب ہر ہر امتی کے ذمہ فرض یا واجب ہے تو دیگر فرائض و واجبات کی طرح شارع نے ان کے دلائل و احکام کو پوری طرح ضبط کیوں نہیں کیا تاکہ امت اس کو بھول نہ جاتی؟

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی شرعی حیثیت

دعوت و تبلیغ کے مقابلہ میں ان کے کرنے والوں کا دائرہ ہم نے زیادہ وسیع بتایا ہے اس کی دلیل ہے حدیث **من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ** (جو کوئی تم میں سے برائی ہوتے دیکھے تو اس کو اپنی قوت بازو سے بدل ڈالے یعنی روک دے)۔

لیکن اس حدیث سے بھی امت کا ہر ہر فرد مراد لینا اور دنیا جہان کا کوئی بھی منکر ہو وہ مراد لینا درست نہیں بلکہ الفاظ اس بارے میں صریح ہیں کہ فقط وہ امتی مراد ہے جو برائی کو ہوتا ہوئے دیکھے یا اس کے علم میں آئے کہ فلاں جگہ میں منکر ہو رہا ہے اور وہاں کے لوگوں نے اس کو روکنے کی کوشش نہیں کی اور اس کو وہاں تک پہنچنے کی آسانی ہو اور وہ اس برائی کو روکنے پر اپنے اندر قدرت بھی پاتا ہو۔

پھر دیکھنے اور علم رکھنے والوں میں سے اگر کسی ایک نے بھی برائی کرنے والے کو برائی سے روک دیا تو باقی سب سے حکم ساقط ہو جاتا ہے اور اگر کسی کو روکنے کی ہمت نہ ہو لیکن کسی ایک نے زبان سے ان کو فہمائش کر دی اور وہ باز نہیں آیا اور مزید کہنے سننے سے فائدہ کی توقع نہ ہو تو باقی سب لوگ دل میں اس کو برا جانیں تو اس سے بھی حکم پر عمل ہو جاتا ہے۔

اہم تنبیہ

دعوت و تبلیغ کی شرعی حیثیت بتانے کا یہ مطلب نہیں کہ اب عوام مسلمان مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں بلکہ اس سے غرض فقط یہ ہے کہ نصوص یعنی آیات و احادیث سے مطالب اخذ کرنے میں جو غلطی کی جا رہی ہے اس سے بچا جائے اور صحیح دلائل کو اختیار کیا جائے۔ اس کو ہم پہلے بھی

ذکر کر چکے ہیں دعوت کا اصل کام علماء کی ذمہ داری ہے البتہ جب کام کے تقاضوں کے مطابق علماء کی تعداد کم ہو تو عوام کو مناسب تربیت دے کر ان سے بھی کام لے سکتے ہیں اور اس دور میں چونکہ دین مغلوب ہے اور کفر وفسق خوب پھیلا ہوا ہے اس لیے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس کام میں لگنے کی ضرورت ہے بلکہ حالات کا تقاضا ہے کہ سب ہی مسلمان اپنے کچھ اوقات کو بھی فارغ کریں اور مالی قربانی بھی دیں اور دین کے جس شعبہ سے ان کو مناسبت ہو اس میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ لگائیں۔

دعوت وتبلیغ اور عورتیں

مولوی طارق جمیل صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کے نزدیک ہر ہر عورت بھی اس کی مکلف ہے کہ وہ دوسروں کو جا کر تبلیغ کرے کیونکہ ہر ہر امتی میں ہر عورت بھی شامل ہے اور مولوی طارق جمیل صاحب تو یہ کھلی کھلی بات کہتے ہیں کہ شاہد کے لفظ کی وجہ سے ''امت کا ہر مسلمان مرد وعورت وہ اللہ کا پیغام آگے پہنچانے والا ہے۔'' حالانکہ حکایات صحابہ میں درج مندرجہ ذیل حکایت ان کے دعوے کی نفی کرتی ہے۔

حضرت اسماء بنت یزید انصاری صحابیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان میں مسلمان عورتوں کی طرف سے بطور قاصد کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ بے شک آپ کو اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا اس لیے ہم عورتوں کی جماعت آپ پر ایمان لائی اور اللہ پر ایمان لائی لیکن ہم عورتوں کی جماعت مکانوں میں گھری رہتی ہے پردوں میں بند رہتی ہے مردوں کے گھروں میں گڑی رہتی ہے اور مردوں کی خواہشیں ہم سے پوری کی جاتی ہیں ہم ان کی اولاد کو پیٹ میں اٹھائے رہتی ہیں اور ان سب باتوں کے باوجود مرد بہت سے ثواب کے کاموں میں ہم سے بڑھے رہتے ہیں۔ جمعہ میں شریک ہوتے ہیں۔ بیماروں کی عیادت کرتے ہیں، جنازوں میں شرکت کرتے ہیں، حج پر حج کرتے رہتے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر جہاد کرتے رہتے ہیں اور جب وہ حج کے لئے یا عمرہ کے لئے یا جہاد کے لئے جاتے ہیں تو ہم عورتیں ان کے مالوں کی حفاظت کرتی ہیں ان کے لئے کپڑا بنتی ہیں، ان کی اولاد کو پالتی ہیں،

کیا ہم ثواب میں ان کی شریک نہیں؟ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ تم نے دین کے بارے میں اس عورت سے بہتر سوال کرنے والی کوئی سنی۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم کو خیال بھی نہ تھا کہ عورت بھی ایسا سوال کرسکتی ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اسماءؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ غور سے سنو اور جن عورتوں نے تم کو بھیجا ہے ان کو بتا دو کہ عورت کا اپنے خاوند کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور اس کی خوشنودی کو ڈھونڈنا اور اس پر عمل کرنا ان سب چیزوں کے ثواب کے برابر ہے۔ اسماءؓ یہ جواب سن کر نہایت خوش ہوتی ہوئی واپس ہوگئیں (حکایات صحابہ۔ حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ)

یہ قصہ اس بارے میں نص صریح ہے کہ عورت کے لئے اصل کے اعتبار سے دین کے نام پر بھی گھر سے نکلنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر جائز ہوتا تو سوال کی مناسبت سے رسول اللہ ﷺ یہ ضرور فرماتے کہ تم بھی اللہ کے راستے میں نکل سکتی ہو۔

غرض یہ مردوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھر کی عورتوں کی دینی ضروریات کا خیال رکھیں ان کی دینی تعلیم کا اہتمام کریں اور ان کو کوئی بھی مسئلہ پیش آجائے تو علماء سے پوچھ کر ان کو بتائیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اس دور کے حالات کی بناء پر عورتوں کو جو نمازوں کے لئے نکلنے کی اجازت تھی آپ ﷺ کے بعد حالات میں تغیر آنے کی وجہ سے وہ نکلنا بھی موقوف ہوگیا تھا اس لئے اصلاً تو تبلیغ کے نام پر بھی عورت کا نکلنا صحیح نہیں اور دعوت و تبلیغ یا جہاد کے لئے نکلنے پر جو فضائل وارد ہوئے ہیں عورتوں سے ان کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ ان کے لئے نکلنے کا حکم نہیں ہے بلکہ گھر میں جمے رہنے کا حکم ہے۔

البتہ جب مجبوری ہو کہ عورت کی دینی ضروریات پوری کرنے کی گھر کے مردوں کو فکر نہ ہو تو اس وقت عورت گھر سے خود دین کا مسئلہ معلوم کرنے کے لئے نکل سکتی ہے اور بنیادی دینی تعلیم دینے کی خاطر معلّمہ بھی اپنے گھر سے نکل سکتی ہے۔ چونکہ آج کل بے دینی اور غفلت بلکہ بد دینی کا رواج و غلبہ ہے اور بہت سے گھرانوں میں مرد اپنی ذمہ داریوں سے غافل اور بے فکر ہیں اس لئے دین کی بنیادی باتیں سیکھنے سکھانے کے لئے ضرورت کے درجہ میں اگر عورتیں پردے اور حجاب کے پورے آداب کے ساتھ نکلیں خواہ ایک عورت ہو یا چند عورتیں مل کر ہوں تو یہ جائز ہے لیکن چونکہ یہ مجبوری کا نکلنا ہے اس لیے اس میں چند باتوں کی رعایت لازم ہے۔

1- دعوت وتبلیغ کے لئے یا علم دین کی طلب کے لئے مستقل نکلنے کی ترغیب نہ دی جائے اور نہ ہی نکلنے کے فضائل بیان کئے جائیں کیونکہ ان فضائل کا تعلق عورتوں سے براہ راست نہیں ہے بلکہ اپنے مردوں کے واسطہ سے ہے جیسا کہ اوپر کے قصہ سے معلوم ہوا۔

2- چونکہ نکلنا ضرورت و مجبوری سے ہے لہٰذا نکلنا بقدر ضرورت ہو جہاں مثلاً دو عورتوں کے نکلنے سے کام چل سکتا ہو وہاں ایک بھی زائد عورت نہ جائے۔

3- چونکہ عورتوں کا نکلنا خود اصل مقصد نہیں ہے بلکہ اصل مقصد ایمان و احکام کو سیکھنا ہے اس لیے اس دوران بھی اور آئندہ کے لئے بھی عورتوں کی بنیادی دینی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہئے۔ پھر جو عورتیں اتنا کچھ سیکھ جائیں وہ بلاوجہ کے ہر قسم کے پروگراموں میں شریک نہ ہوں بلکہ اپنے گھر میں رہتے ہوئے پاس پڑوس کی عورتوں اور بچیوں میں محنت کریں تا کہ زیادہ عورتوں کو نکلنے کی ضرورت نہ پڑے۔

5- دین کا کام کرنے کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک میاں بیوی جن کو ضرورت کی دینی تعلیم دی گئی ہو وہ کسی محلّہ میں جا کر دس پندرہ دن یا کم و بیش ٹھہر جائیں اور محلّہ کی عورتیں ان خاتون سے آ کر دین کے احکام اور فضائل سیکھیں۔

اہم تنبیہ: ہم نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو دعوت وتبلیغ سے علیحدہ شعبہ شمار کیا ہے۔اس کی وجہ بھی ہم بتا چکے ہیں لہٰذا جو حضرات ان کو ایک دوسرے کا شعبہ قرار دیتے ہیں ان کی بات کو ہم اگرچہ محترم خیال کرتے ہیں لیکن اس کو ہم پر حجت نہیں بنایا جا سکتا۔

کیا یہ امت ختم نبوت کی بنا پر نیابت نبوت کے لئے مبعوث ہوئی ہے؟

2- یہ کہنا یہ امت ختم نبوت کی بناء پر نیابت نبوت کے لئے مبعوث ہوئی ہے درست نہیں کیونکہ اگر یہ بات اس خیال پر مبنی ہے کہ پچھلی امتوں پر دعوت اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری نہیں تھی تو یہ بات نصوص کے خلاف ہے۔ قرآن پاک میں اصحاب سبت کا ذکر ہے یعنی وہ لوگ جن کو ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار سے منع کیا گیا تھا لیکن انہوں نے شکار کے حیلے بہانے ایجاد کر کے نافرمانی کا ارتکاب کیا۔ ان کو کچھ لوگوں نے ایسا کرنے سے منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے باقی کچھ لوگوں نے ان منع کرنے والوں کو کہا کہ تم ان لوگوں کو جن کو اللہ نے ہلاک کرنا

ہے یا عذاب دینا ہے کیوں نصیحت کرتے ہو۔ مطلب یہ تھا کہ یہ ماننے پر تیار نہیں ہیں تو ان کو مزید نصیحت کرنا بھی چھوڑ دو۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہمارا یہ نصیحت کرنا اللہ کے نزدیک ہمارا عذر بن جائے گا کہ ہم نے نہی عن المنکر کی اپنی ذمہ داری پوری کردی تھی۔

اسی طرح قرآن پاک میں امتوں میں دعوت کے واقعات بھی مذکور ہیں۔ سورہ مومن میں آل فرعون میں سے ایمان قبول کرنے والے ایک شخص کا طویل دعوتی بیان مذکور ہے۔ اسی طرح سورہ بروج میں اصحاب اخدود کا ذکر ہے جو ایک راہب کی شاگردی کرنے والے لڑکے کی بدولت مسلمان ہوئے۔ اس لڑے کا لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا صحیح مسلم میں مذکور ہے۔ پھر خود وہ لڑکا بھی تو راہب کی دعوت سے مسلمان ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین کی دعوت وتبلیغ سے آپ کا دین پھیلا جو کہ تاریخ سے ثابت ہے۔

اور اگر یہ بات اس خیال پر مبنی ہے کہ یہ امت پوری دنیا کے لئے نکالی گئی ہے تو اس کا سبب ختم نبوت نہیں بلکہ نبی ﷺ کی نبوت کا عالمی ہونا ہے۔

ختم نبوت کی وجہ سے اس امت کو جو فضیلت اور ذمہ داری حاصل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اس امت کے علماء کو بنی اسرائیل کے انبیاء کے ساتھ تشبیہ دی گئی کہ ان کا بھی وہی کام ہے جو ان انبیاء کا تھا۔ دوسرے اس امت میں مجددین کا سلسلہ چلا ہے کہ گمراہوں نے دین میں خرابی پیدا کرنے کی جو کوششیں کی ہوں ان کے اثرات کو یہ مجددین دور کریں اور دین کو خالص کریں۔

پانچویں بحث

مولوی طارق جمیل صاحب اور موجودہ دور میں اصلاح کی راہ

مولوی طارق جمیل صاحب کہتے ہیں۔

''اب ہم کچے مسلمان ہیں...... ہمیں کہاں سے راستہ ملے گا؟ ...... ہم کچے مسلمان ہیں ہمیں اس بھنور سے نکلنے کے لئے جو راستہ ملے گا وہ صحابہ کے دور میں نہیں ہے...... پیچھے جانا پڑے گا پیچھے بنی اسرائیل میں جانا پڑے گا۔ وہ کچے مسلمان تھے وہ اس بھنور سے کیسے نکلے تھے؟ وہ راستہ اختیار کریں گے تو ہم نکلیں گے۔ میرے نبی کے دور میں کوئی بے نمازی تھا نہ خلفائے راشدین کے دور میں کوئی بے نمازی تھا...... جب (معصیت اور ظلم کا) یہ (سب کام) ہو رہا ہے اب ہمیں خلفائے راشدین سے مثال نہیں ملے گی نبوی دور سے مثال نہیں ملے گی۔ بدر، احد، خندق ہمارے لیے دلیل نہیں بنیں گے ہمیں پیچھے جانا پڑے گا۔ یہی کچھ بنی اسرائیل کر رہے تھے تو اللہ نے ان پر فرعون کو چڑھایا پھر کیا ہوا اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو چالیس سال ان پر لگایا صفائی کرائی کہ ان تبوء ا لقومکما...... واقیموا الصلوۃ نمازیں پڑھو، گھروں کو مسجد بناؤ اللہ پر توکل کرو، توبہ کرو، استغفار کرو، اللہ کے سامنے جھکو۔ چالیس سال موسیٰ علیہ السلام فرعون کا ظلم سہتے رہے احتجاج نہیں کیا چپ کر کے ظلم سہا، قوم کو ایمان پر لاتے رہے، جب وہ اس سطح پر آگئے کہ اب اللہ کی رحمت کا در کھل جائے گا اور فرعون پر حجت پوری ہو گئی تو اللہ نے وہاں سے نکالا پار کروایا، فرعون کو غرق کیا اور انہیں پار کر کے وہاں تک پہنچا دیا۔

ہم کہتے ہیں

مولوی طارق جمیل صاحب نے یہاں بھی خلط مبحث کیا ہے۔

1- اول تو چالیس سال کی بات فرعون سے نجات کے بعد کی ہے پہلے کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری دور میں جب بنی اسرائیل نے ارض مقدس کی فتح کا وعدہ دئے جانے کے باوجود اس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ آپ اور آپ کا رب جا کر لڑے ہم تو یہاں بیٹھے ہیں اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے چالیس سال تک وادی تیہ میں بھٹکنے کی سزا بتائی۔ اسی مدت کے دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال ہوا۔

2- فرعون سے نجات سے پہلے بنی اسرائیل کی دینی حالت کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ بس اتنا ملتا ہے کہ وہ فرعون اور فرعونیوں کے ظلم وستم کا شکار تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاں فرعون کو اسلام کی دعوت دی وہیں اس سے بنی اسرائیل کی خلاصی کا بھی تذکرہ کیا۔ اس وقت کے بنی اسرائیل کو ہمارے جیسا بدعمل کہا جائے، یہ تو بلا دلیل کا بہتان ہے۔

3- بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کی جو طویل داستان ہے وہ فرعون سے نجات کے بعد کی اور وادی تیہ میں بھٹکنے کی سزا ملنے کے درمیان کی مدت کی ہے۔

4- مولوی طارق جمیل صاحب نے جو آیت ذکر کی ہے وہ اس وقت کی ہے جب فرعون نے دوبارہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جمع کر کے صبر کرنے اور اللہ پر بھروسہ کرنے کی تلقین کی۔ بنی اسرائیل نے جواب دیا کہ آپ کے آنے سے پہلے بھی ہم عذاب میں تھے اور آپ کے آنے سے امید بندھی تھی لیکن ہمارا عذاب تو ابھی تک جاری ہے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تسلی دی اور کہا کہ اللہ کا فیصلہ آنے تک صبر کرو اور سرزمین مصر ہی میں اپنے گھروں کو مسجد بنا لو اور ان کو قبلہ رخ کر کے نماز قائم کرو۔

یہ اصل بات کا خلاصہ ہے جو ہم نے ذکر کیا اور یہ صحیح ہے کہ ہمیں بھی توبہ و استغفار اور اللہ کے سامنے جھکنے کی ضرورت ہے لیکن مولوی طارق جمیل صاحب نے جو کہانی بنائی ہے وہ ساری اپنی طبع زاد ہے اور اس طبع زاد پر انہوں نے اس امت کی اصلاح کا ضابطہ بنایا ہے۔

5- عجیب بات ہے کہ مولوی طارق جمیل صاحب یہ کہتے ہیں کہ ”ہم کچے مسلمان ہیں ہمیں اس بھنور سے نکلنے کے لئے جو راستہ ملے گا وہ صحابہ کے دور میں نہیں ہے...... بدر، احد،

خندق ہمارے لئے دلیل نہیں بنیں گے ہمیں پیچھے جانا پڑے گا۔ یہی کچھ بنی اسرائیل کر رہے تھے تو اللہ نے ان پر فرعون کو چڑھایا پھر کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو چالیس سال ان پر لگایا صفائی کرائی...... نمازیں پڑھو، گھروں کو مسجدیں بناؤ، اللہ پر توکل کرو، توبہ کرو۔ استغفار کرو، اللہ کے سامنے جھکو۔ چالیس سال موسیٰ علیہ السلام فرعون کا ظلم سہتے رہے احتجاج نہیں کیا چپ کر کے ظلم سہا قوم کو ایمان پر لاتے رہے۔ جب وہ اس سطح پر آ گئے کہ اب اللہ کی رحمت کا در کھل جائے گا اور فرعون پر حجت پوری ہو گئی تو اللہ نے وہاں سے نکالا پار کروایا،، فرعون کو غرق کیا۔

مولوی طارق جمیل صاحب تو یہ بات کہتے ہیں کہ موجودہ بھنور سے نکلنے کے لیے ہمیں جو راستہ ملے گا وہ صحابہ کے دور میں نہیں ہے جب کہ مولانا الیاسؒ اپنی دعوت وتحریک کے متعلق کبھی کبھی فرماتے تھے کہ یہ قرن اول (یعنی صحابہ کے دور) کا ہیرا ہے'' (حضرت مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت) یعنی مولانا الیاسؒ بھنور سے نکلنے کا راستہ صحابہ کے دور سے ہی لاتے ہیں۔ نیز تبلیغ والوں کے نصاب میں بھی حکایات صحابہ مستقل رسالہ کے طور پر موجود ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی اصلاح کے لیے صحابہ کے دور کی طرف دیکھتے ہیں۔ مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ کی تصنیف حیاۃ الصحابہ بھی اسی مدار پر ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولوی طارق جمیل صاحب نے پھر ایسا کیوں کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے دور میں دو کام ملتے ہیں ایک دعوت اور دوسرا جہاد و قتال جس میں بدر، احد اور خندق بھی پیش آئے۔ مولوی طارق جمیل صاحب اگر مولانا الیاسؒ والی بات کہتے تو اس پر کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ قرن اول کے ہیرے کا ایک ٹکڑا ہے پورا ہیرا نہیں ہے کیونکہ اس کام میں جہاد و قتال شامل نہیں ہے۔ چونکہ طارق جمیل صاحب یہ طے کئے بیٹھے ہیں کہ اس دور میں استعداد نہ ہونے کی وجہ سے جہاد ہے ہی نہیں بس صبر ہی صبر ہے اور جو لوگ جہاد کے نام پر اپنی جانیں دے رہے ہیں وہ فضول میں دے رہے ہیں تو انہوں نے صحابہ کے دور کو بھی پیچھے چھوڑا اور کوئی مثال نہیں ملی تو بنی اسرائیل کے بارے میں اپنی طرف سے من گھڑت کہانی بنائی اور یہ حاصل نکالا کہ ''چالیس سال تک موسیٰ علیہ السلام فرعون کا ظلم سہتے رہے احتجاج نہیں کیا چپ کر کے ظلم سہا قوم کو ایمان پر لاتے رہے۔ جب وہ اس سطح پر آ

گئے کہ اب اللہ کی رحمت کا در کھل جائے گا۔'' یعنی ایمان پر اور نماز و توبہ پر لانے کے لئے تو صحابہ کے دعوت کے کام کو لیا جائے۔ کیونکہ یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی کرتے رہے اور نماز و توبہ پر آنے کے بعد مستقل نمازیں پڑھو توبہ و استغفار کرو یہاں تک کہ جب ایمان و توبہ کی خاص سطح پر پہنچ جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کسی کے کسی اقدام کے بغیر فرعون کی طرح امریکہ و یورپ اور ان کے حواریوں کو خود ہی تباہ و برباد کر دیں گے۔ تم نہ جہاد کا سوچو اور نہ احتجاج کرو بس صبر کرو اور صبر کرو۔

چھٹی بحث:

مولوی طارق جمیل صاحب کا موجودہ تبلیغی کام کے بارے میں غلو

مولوی طارق جمیل صاحب کہتے ہیں۔

''مولانا الیاسؒ پر اللہ تعالیٰ نے جو پیغام فرمایا پچھلی کئی صدیوں میں کسی پر نہیں ہوا۔ پچھلے ہزار سال بھی میں کہوں تو یہ مبالغہ نہیں ہے۔''

ہم کہتے ہیں کہ

مولوی طارق جمیل صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا الیاسؒ پر کیا پیغام نازل فرمایا۔ اگر یہ پیغام نازل فرمایا تھا کہ مسلمان اب کمزور ہیں اور کمزوری کے احکام اور ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ الہام کمزوری کے زمانے ہی میں ہونا تھا۔ جب مسلمان قوت میں تھے اس وقت یہ الہام کیوں ہوتا۔ اور اگر تبلیغ کا موجودہ طریقہ الہام کیا تھا تو تب بھی ظاہر ہے کیونکہ جب مولوی طارق جمیل صاحب کے مطابق مولانا الیاسؒ کو یہ الہام بھی ہوا تھا کہ اس وقت مسلمان کمزور ہیں تو کام کا جو طریقہ الہام کیا گیا وہ بھی کمزوری کے زمانے کے موافق ہونا تھا۔ جب مسلمان قوت میں تھے اس وقت کمزوری کے حالات والا طریقہ کیوں الہام کیا جاتا۔ اور اگر وہ کوئی ایسا پیغام تھا جو سابقہ قوت کے زمانوں میں بھی مؤثر اور ضروری تھا تو پھر دو باتیں ہیں:

i- وہ دلائل اربعہ سے قابل استنباط ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو یہ تو نئی وحی ہوئی جو رسول اللہ ﷺ کے بعد متصور نہیں۔

ii- اور اگر وہ قابل استنباط ہے تو پھر وہ الہام محض لطف وعنایت خداوندی ہے۔ لیکن پھر سوال یہ ابھرتا ہے کہ قابل استنباط ہونے کے باوجود پوری کی پوری امت ضرورت کے وقت میں اس کا استنباط کیوں نہ کر سکی۔ یہ بات تو اس کے معتدل امت ہونے کے خلاف ہے۔ اور

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے الہام فرمایا تو پہلے نہ کرنے اور اب کرنے میں کیا چیز مؤثر اور مرجح بنی۔ غرض مولوی طارق جمیل صاحب کے اس ایک جملہ سے کتنے ہی سوال ابھرتے ہیں جن کو انہوں نے لاینحل چھوڑ دیا۔

اس عقدہ لاینحل کو اب ہم کھولتے ہیں۔ مولوی طارق جمیل صاحب کے اس جملہ میں دراصل اجمال ہے اور اس اجمال کی تفصیل مولانا سعید خان صاحب کا بیان ہے جو انہوں نے جناب بابو بشیر صاحب مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''دعوت کے کام کو چھوڑے ہوئے تیرہ سو سال ہو گئے اور اس کے منافع اور اس کی عظمت اور اس کی ضرورت اور اس کا طریقہ اور اس کے اصول اور اس کا اسلوب اس وقت اہل زمانہ کے دماغوں سے سب مجہول ہو گئے۔ ہر ایک اپنے اپنے علم و فہم کے اعتبار سے جو صحابہ ﷺ کے علم و فہم سے جداگانہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کے مزاج سے بہت دور ہے اپنی اپنی رائے زنی کرتے ہوئے دعوت کی ضرورت کو بیان کرتا ہے حالانکہ دعوت علم کے اعتبار سے جو عمل سے علیحدہ ہو گیا ہے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ حضرت مولانا الیاسؒ پر حق تعالیٰ نے خصوصیت سے وہ کچھ کھولا جو دوسرے علماء پر نہیں کھولا اس لئے اس کام کے کسی عمل کو علمی دلائل سے سمجھانا صحیح نہیں۔'' (مکاتیب مولانا سعید خان صاحب ص 92)

ہم کہتے ہیں:

یہ کہنا کہ امت تیرہ سو سال سے دعوت کے کام کو سرے سے بھولی رہی اور اس کے اصول و آداب اور اسلوب و ضرورت سب دماغوں سے محو ہو گئے تو یہ امت پر بہت بڑا الزام ہے۔ دعوت و تبلیغ بھی دین کا ایک حصہ ہے اور دین کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لے رکھا ہے لہٰذا یہ بات کبھی درست نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ بات ماننے سے لازم آئے گا کہ کچھ صحابہ، بہت سے تابعین اور سارے ہی تبع تابعین نے رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہ کے دعوت والے کام کو آگے نہ چلایا۔

ہاں ہر دور کے اعتبار سے دعوت کی صورتیں مختلف رہیں۔ مسلم معاشرہ میں وعظ و نصیحت اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ صوفیاء بھی اصلاح و ارشاد کا کام کرتے رہے ہیں

اور کتنے ہی ممالک میں بہت بعد کے زمانے میں اسلام پھیلا ہے۔ تاتاریوں میں اسلام آیا تو وہ بھی آخر کسی کی دعوت ہی کا اثر تھا۔ ہندوستان میں مغل بادشاہ اکبر کے زمانے کی بددینی حضرت مجدد صاحبؒ کی داعیانہ کوششوں کی بدولت ہی ختم ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کو حضرت شاہ ولی اللہ کی دعوت ہی مرہٹوں کے خلاف میدان میں لائی۔ انگریزوں کے مکمل تسلط کے بعد دارالعلوم دیو بند نے اپنا کام کیا جو کہ دعوت ہی کا کام تھا۔ یورپ والوں اور انگریزوں کی واپسی کا دور شروع ہونے لگا تو مسلمان ملکوں میں جو طبقہ برسراقتدار آنا تھا وہ کہنے کو تو اگرچہ مسلمان تھا لیکن مغربی آقاؤں کا فکر اور عمل دونوں طرح سے مکمل غلام تھا۔ مغرب والوں کو دین کے نام پر ٹکرانے کی مزید سکت نہ تھی۔ لیکن ان غلام حکمرانوں کو یہ اطمینان تھا کہ ہم بھی مسلمان ہیں اور اسلام بس وہی ہے جو ہم نے سمجھا ہے لہٰذا دین کے نام پر ہمارا مقابلہ کرنے والے قابل گردن زنی ہیں۔ مصر اور بعض دیگر ملکوں میں اور اب پاکستان میں بھی اس کا مظاہرہ بھی ہو چکا ہے کہ نئے مسلم حکمرانوں نے دینی قوتوں سے اپنے فائدے نکالے اور پھر ان کو پوری طرح کچلنے میں مصروف ہو گئے اور دھوکہ وفریب اور ظلم و بربریت میں اپنے مغربی آقاؤں سے بھی آگے بڑھ گئے۔

ایسے حالات میں جب کہ ساری قوت نئے حکمرانوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہونے والی تھی اور مغربی دنیا کی ان کو مکمل پشت پناہی حاصل ہونی تھی اور بے دینی اور بددینی کو پھیلانے کی بھر پور کوششیں ہو رہی تھیں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا الیاسؒ کو یہ طریقہ الہام فرمایا تا کہ ظاہری کشمکش سے بچتے ہوئے ایمان و یقین کی دعوت چلے اور بحمد اللہ اس طریقے سے بہت فائدہ ہوا اور ہو رہا ہے۔

حضرت مولانا الیاسؒ نے خواب میں دیکھا تھا کہ ان سے کہا گیا کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ یہی کچھ واقعہ ان سے پہلے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان سے بھی پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ پیش آ چکا تھا۔ ان حضرات کے کام بھی الہامی تھے۔ اگر حضرت مولانا الیاسؒ کا طریقہ ہی ضروری تھا تو ان حضرات کو اس کے خلاف کیوں الہام ہوا۔ بات وہی ہے جو ہم نے ذکر کی اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں دعوت کے جس طریقہ کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے اس کو حضرت مولانا الیاسؒ پر کھولا اور ان کو اس کے آداب و اصول کو نصوص سے استنباط کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ایسا نہیں ہوا کہ ان کو ماوراء نصوص کوئی نئی

باتیں الہام ہوئی ہوں۔اس استنباط و اجتہاد میں وہ معصوم نہیں تھے اگر ان کی کوئی بات نصوص کے خلاف ہوگی تو اصولی طور پر وہ قابل اصلاح ہوگی۔

کسی کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ مولانا سعید خان صاحب کی بات کا مطلب یہی تو ہے کہ دعوت کا کام صحابہ کے دور کا تھا جو پھر معطل ہوگیا تھا اور مولانا الیاسؒ نے بھی یہی بات فرمائی تھی جیسا کہ مولانا منظور نعمانیؒ لکھتے ہیں:

''مولانا (الیاس) مرحوم اپنی دعوت وتحریک کے متعلق کبھی کبھی فرماتے تھے کہ یہ قرن اول کا ہیرا ہے۔'' (حضرت مولانا الیاس اوران کی دینی دعوت ص 38)

یعنی قرن اول اور صحابہ کے دور کا کام ہے لہٰذا مولانا سعید خان صاحب پر اعتراض نہ رہا۔

ہم کہتے ہیں: کہ دونوں کی باتوں میں بہت فرق ہے کیونکہ صحابہ کے دور کا کام اور ہیرا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تیرہ سو سال تک کام معطل و مدفون رہا ہو اور اس طویل دور کے لوگ اس کی حقیقت اور اس کے اسلوب تک سے ناواقف رہ گئے ہوں اور پھر بالآخر مولانا الیاسؒ نے اس کو کہیں سے کھود کر ڈھونڈ نکالا ہو۔ یہ تو مودودی صاحب کا طرز عمل ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کی بنیادی اصطلاحات یعنی دین اور عبادت وغیرہ پر صدیوں کا گرد وغبار پڑا رہا اور پھر انہوں نے اس گرد وغبار کو دور کر کے ان اصطلاحات کے اصل مفہوم لوگوں کے سامنے کھولے۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور دعوت الی الخیر دو علیحدہ علیحدہ شعبے ہیں۔ دعوت الی الخیر سے مراد قران وسنت کی اتباع کی دعوت ہے۔ یہ دعوت کافروں کو بھی ہے اور مسلمانوں کو بھی ہے۔ مسلمانوں کو دین کے عقائد اور اخلاق و احکام کی دعوت ہے اور کافروں کو اسلام و ایمان کی دعوت ہے۔ دعوت الی الخیر یا دوسرے لفظوں میں دعوت وتبلیغ کا کام اصلا علماء کی ذمہ داری ہے۔

مسلمانوں میں دعوت الی الخیر کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

1- دعوت الی الخیر کے کام کرنے والی جماعت کے تسلسل کو قائم رکھنے اور محفوظ رکھنے کی تدبیر کرنا یعنی علماء کو تسلسل سے تیار کرنا۔ اس کے لئے مدارس کو قائم کرنا اور وہاں تعلیم دینا بھی دعوت وتبلیغ کا حصہ ہے۔

2- مسلمان عوام کی تعلیم و تربیت کے لئے درس کے حلقے قائم کرنا، وعظ کرنا، لوگوں کو دین کے مسائل واخلاق سکھانا، قرآن پاک کی تعلیم کا انتظام کرنا، تزکیہ نفس کی تعلیم دینا یہ سب باتیں دعوت الی الخیر میں داخل ہیں۔ پھر اس کے لئے وہ چاہیں زبانی دعوت دیں خواہ فرد فرد سے یا لوگوں کے اجتماع سے یا تحریر کے ذریعہ دعوت دیں یعنی دین کے مختلف احکام سے متعلق کتابیں اور رسالے لوگوں کے لئے لکھیں یہ بھی دعوت ہی کا حصہ ہے۔

3- جو لوگ مسلمانوں میں گمراہیاں پھیلانے میں لگے ہیں ان کا توڑ کرنا اور مسلمان عوام کو ان کی گمراہیوں سے آگاہ کرنا اوران سے بچنے کی تاکید کرنا۔

مسلمانوں میں دعوت وتبلیغ کے مندرجہ بالا طریقے صحابہ کے دور سے اب تک قائم ہیں۔ بعد کے ادوار میں علماء کے کوتاہی کرنے کا ہم انکار نہیں کرتے لیکن پھر بھی نمایاں طریقے سے یہ کام ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔

کافروں میں اسلام کی دعوت کا جہاں تک تعلق ہے تو اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عربوں کی طرف براہ راست بعثت ہوئی تھی اور ان کے لئے صرف دو ہی راستے تھے یا تو مسلمان ہو جائیں یا قتل ہو جائیں الا یہ کہ کوئی جزیرہ نما عرب سے ہی نکل جائے۔ لیکن ایک وقت تک صرف دعوت وتبلیغ کا حکم رہا اور رسول اللہ ﷺ کو یہی حکم رہا کہ آپ یہی کام کرتے رہیں اور آپ کے ساتھ صحابہ بھی یہ کام کرتے رہے۔ یہ ایک ہیرا تھا۔ اس وقت میں دعوت کا رنگ یہی تھا۔ کہ ہر ایک کے پاس جانا اور اسے سمجھانا اور منت سماجت بھی کرنا۔ لیکن صحابہ ہی کے دور میں جب ان کو جہاد کا دوسرا ہیرا ملا تو اگرچہ دعوت کا کام موجود رہا لیکن اب رنگ بدلنے لگا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اب کمزوری کا دور گزر گیا تھا اور قوت وشوکت حاصل ہونے لگی تھی اس لئے اب دعوت میں قوت کا استعمال ہونے لگا تھا یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد بہت سے قبائل جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے تو محض قریش کے مقابلہ میں اسلام کے غلبہ کی وجہ سے ہوئے اور مکہ مکرمہ کے مشرکین بھی مجبور ہوئے کہ یا تو اسلام قبول کر لیں یا جزیرہ نما عرب سے نکل جائیں۔

پھر جب دوسری قوموں کا معاملہ پیش آیا تو دعوت اور جہاد ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ پورا مسلح لشکر نکلتا تھا اور دعوت اس رنگ میں دی جاتی تھی کہ یا تو اسلام قبول کرلو یا اسلامی حکومت

کے باج گزار بن جاؤ یا پھر جنگ کرلو اور کفر کے مقابلہ میں اسلام کا کلمہ اور اس کی شوکت غالب رہے اور تم زندہ رہو تو ذمی بن کے رہو۔

غرض جیسے جیسے صحابہ کے حالات بدلتے گئے دعوت کا رنگ بدلتا گیا۔ ایسے ہی بعد کے زمانوں میں ہوا۔

پھر ذمیوں میں کچھ تو اسلام کی اپنی حقانیت اور کشش کی وجہ سے اور کچھ مسلمانوں کے اعمال و اخلاق سے اسلام آیا لیکن ان میں اسلام آنے کا بڑا ذریعہ دعوت تھی جو علماء وصوفیاء کی طرف سے دی گئی۔

مسلمانوں میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر

مسلمانوں میں اچھے کاموں میں سستی کرنے پر اور برائی کا ارتکاب کرنے پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے شعبے کے تحت علماء اور عوام کچھ نہ کچھ کام کرتے ہی رہے ہیں۔

مسلمانوں کے زوال اور غیر مسلموں کے غلبہ کے باعث جو بے دینی اور بد دینی پھیلی ہے تو اس میں اگرچہ کرنے کا اصل کام امر بالمعروف ونہی عن المنکر تھا لیکن اس کا زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔ وعظ ونصیحت اور درس وتدریس صرف انہی لوگوں کو مفید تھے جو ان میں حاضر ہوتے تھے جب کہ اب حالات یہ بن گئے تھے کہ کافروں کے غلبہ نے اور ان کے اسلام دشمن انتظامات نے بہت سے عوام مسلمانوں کے مزاج میں دین کی طرف سے غفلت ولا پرواہی پیدا کردی اور علماء کی وقعت ان کے دلوں سے نکال دی۔ غرض امر بالمعروف ونہی عن المنکر عام طور سے غیر مؤثر ہوئے اور وعظ ودرس میں یہ شریک ہی نہیں ہوتے تھے۔

ایسے میں اللہ تعالیٰ نے مولانا الیاسؒ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ بے دینی اور بد دینی کے ان حالات میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے ابتدائی دور میں جس طرح سے کافروں میں دعوت وتبلیغ کا کام کیا تھا اسی نہج پر مسلمانوں میں کام کیا جائے۔ یہ ایک بالکل نیا معاملہ تھا کہ جو کام مسلمانوں میں اصلا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ کرنے کا تھا اس کو دعوت وتبلیغ کے اس طریقہ سے کیا جائے جو ابتداء ایک کافر معاشرہ میں اختیار کیا گیا تھا کہ ایک ایک کے پاس جائیں اور منت سماجت کریں اور سمجھائیں بجھائیں۔

چونکہ یہ کام دعوت کا ہے اور دعوت کے کام کے کچھ اصول اور ضابطے اور آداب ہوتے ہیں اس لئے اصلا یہ ذمہ داری علماء کی ہے لیکن چونکہ بے دینی کے حالات ساری اسلامی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے ضرورت کے وسیع ہونے کی وجہ سے عوام کو تربیت دے کر ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔

اس سب کے باوجود یہ ایک اجتہادی اور ظنی طریقہ ہے اور اس سے دعوت الی الخیر کے دوسرے طریقوں کی اور اصحاب عزیمت کے حق میں جہاد کی نفی کرنا درست نہیں ہے۔

ساتویں بحث

مولوی طارق جمیل اور دوسرے اصحاب کی باقاعدگیاں

ا- مولوی طارق جمیل صاحب کی بے قاعدگی: خلیفہ نائب اور وارث کی بات

مولوی طارق جمیل صاحب کہتے ہیں۔

''عبدالوہاب صاحب اللہ تعالیٰ کے بڑے مقرب بندے ہیں...... ان کو ایک درد وغم ہے کہ کسی طرح لوگ اس کام پر آ جائیں ...... تو بس وہ کبھی کوئی بات چلاتے ہیں کبھی کوئی چلاتے ہیں۔ تو یہ بات انہوں نے چلانی شروع کر دی کہ شاید میں یہ کہوں گا تو ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوگا اور وہ یہ کام کرنا شروع کر دیں گے۔ انہوں نے کہا ہر آدمی خلیفہ ہے ہر آدمی خلیفہ ہے ہر آدمی نائب ہے ہر آدمی نائب ہے **توانی جاعل فی الارض خلیفة**...... تو اب خلیفہ کا اصل تو ہے **یخلف بعضکم بعض** اور دوسرے معنی میں بھی لیا گیا ہے کہ وہ ہر انسان کے لئے نہیں ہے۔ وہ مفتی شفیع صاحب نے اس پر لکھا ہے اور علماء نے بھی لکھا ہے تو اس وقت یہ خیال آیا کہ بھائی ہر آدمی کیسے اللہ کا خلیفہ ہو سکتا ہے؟ ایک آدمی زانی، شرابی، جواری...... وہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اللہ کے نائب ہیں...... اب ہم کہیں وہ اللہ کا خلیفہ ہے ادھر وہ چوری کر رہا ہے ڈاکے ڈال رہا ہے...... پھر میری بات ہوئی عبدالواہاب صاحب سے، مولانا جمشید صاحب سے تو پھر معاملہ پیچھے ہٹ گیا۔''

ہم کہتے ہیں۔

1- معاملہ صرف خدا کے خلیفہ ہی کا نہیں بلکہ نبی اور قران کے وارث کی بات بھی چلی تھی

کہ ہر ہر امتی نبی کا بھی وارث ہے اور قران کا بھی وارث ہے۔

2- یہ بات بعید ہے کہ عبدالوہاب صاحب نے از خود یہ بات نکال لی ہو بلکہ یہ باتیں تبلیغی حلقے کے علماء نے بتائیں اور عبدالوہاب صاحب نے ان کو لے کر چلا دیا۔ اتنی بات تو بہر حال امر واقعی ہے کہ عبدالوہاب صاحب یہ بات ایک عرصہ تک چلاتے رہے اور رائے ونڈ کے علمی حلقوں نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ دوسرے حضرات اس کے خلاف اپنی آواز اٹھاتے رہے لیکن رائے ونڈ کے علماء نے اس پر چنداں توجہ نہیں کی۔ ہاں جب مولوی طارق جمیل صاحب کے اپنے دماغ میں سمائی تو انہوں نے پھر رکوایا۔ یا تو رائے ونڈ اور تبلیغ سے وابستہ علماء حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے یا مداہنت سے کام لیتے ہیں۔

3- ہر ہر شخص اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے اس کے غلط ہونے کو تو مولوی طارق جمیل صاحب نے سمجھ لیا اور سمجھا دیا لیکن بات تو یہ بھی کہی گئی تھی کہ ہر ہر شخص رسول کا نائب اور کتاب اللہ کا وارث ہے۔ اس کے غلط ہونے کو شاید وہ ابھی تک نہیں سمجھے کہ ایک آدمی زانی، شرابی اور جواری ہو تو یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ یہ رسول کے نائب اور کتاب اللہ کے وارث ہیں اور نہ ہی انہوں نے یہ بات سمجھی کہ رسول اللہ ﷺ نے تخصیص کے ساتھ کیوں فرمایا کہ **العلماء ورثة الانبياء**.

4- مولوی طارق جمیل صاحب اتنی بڑی غلطی کو جناب عبدالوہاب صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں پھر بھی یہ حکم لگاتے ہیں کہ "یہ سارے آجکل کے حضرت مولانا اور علامے اس شخص کے قدموں کی خاک بھی نہیں ہیں"۔ ہم تو تقابل میں نہیں پڑتے اور دین کے مدد گاروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں نہ جانے مولوی طارق جمیل صاحب نے ذوات میں تقابل کرنا کس سے سیکھا ہے ان کی جماعت نے ان کو اس کی اجازت کیونکر دی ہے۔

II- مولانا احسان صاحب کی بے قاعدگی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کی بات ہے انہوں نے ایک رات ایک عورت کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا۔

فو الله لو لا الله تخشي عواقبه   لزحزح من هذا السرير جوانبه

اللہ کی قسم اگر (فعل بد کے) انجام کا ڈر نہ ہوتا تو اس چار پائی کے کنارے اس سے دور ہو جاتے۔

حضرت عمرؓ نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ ایک عورت کے شوہر کو جہاد میں گئے بڑا عرصہ ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر کہ اس عورت کو اپنے شوہر کی طلب ہو رہی ہے اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ سے پوچھا کہ عورت اپنے مرد کے بغیر کتنا عرصہ رہ سکتی ہے۔ حضرت حفصہؓ خود بھی عورت تھیں بلکہ ام المومنین بھی تھیں اور عورتیں اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتی تھیں اس لئے وہ عورتوں کی فطری ضروریات سے خوب باخبر ہوں گی۔ انہوں نے تحقیقی جواب دیا کہ چار ماہ تک۔ ان کا متعین جواب دینا اس بات پر دلیل ہے کہ ان کو اس بات کی تحقیق ہو گی ورنہ صحابہ اور صحابیات نہ تو تکلف برتتے تھے اور نہ ہی اٹکل سے جواب دیتے تھے۔ پھر حضرت عمرؓ کا ان کے جواب کو قبول کرنا اور دیگر صحابہ میں سے کسی کا اس پر انکار نہ کرنا اس جواب کے صحیح اور حق ہونے پر دلیل ہے۔ اس کی بنیاد پر حضرت عمرؓ نے علامہ ابن عابدین کے الفاظ میں یہ حکم جاری فرمایا:

امر امراء الاجناد ان لا يتخلف المتزوج عن اهله اكثر منها

لشکروں کے امیروں کو حکم دیا کہ کوئی شادی شدہ فوجی اپنے گھر والوں سے چار ماہ سے زائد غائب نہ رہے۔

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کے یہ الفاظ روایت بالمعنی ہیں جب کہ حدیث کی کتابوں میں جو الفاظ ملتے ہیں وہ یہ ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا **لا تحبس الجيش** (میں چار ماہ سے زائد لشکر کو نہیں روکوں گا) یا فرمایا **لا تجسس الجيوش** (چار ماہ سے زائد لشکروں کو نہ روکا جائے۔)

پورے قصہ کو سامنے رکھا جائے کہ حضرت عمرؓ کا حکم ایک عورت کی خواہش پر تھا اور عورتوں کی خاطر سے تھا کسی مرد نے مطالبہ نہیں کیا تھا تو حضرت عمرؓ سے منقول الفاظ کا وہی مطلب نکلتا ہے جو علامہ ابن عابدینؒ نے لکھا ہے لیکن رائے ونڈ مدرسہ کے مولانا احسان صاحب نے حیاۃ الصحابہ کے اپنے ترجمہ میں بین القوسین کچھ الفاظ بڑھا کر حکم کا مفہوم بدل دیا۔ انہوں نے ترجمہ یوں کیا: (اگر فوجی چھٹی مانگیں تو) ان کو روکا نہ جائے۔

جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ نے تمام شادی شدہ فوجیوں کے بارے میں لازمی چھٹی کا ضابطہ نہیں بنایا بلکہ صرف اتنا ضابطہ بنایا کہ جو شادی شدہ فوجی چار ماہ بعد چھٹی مانگے اس کو چھٹی دی جائے اور جو نہ مانگے اس کو نہ دی جائے۔ یہ مفہوم ایک تو پورے قصہ سے جڑتا نہیں ہے اور دوسرے اصل مقصد یعنی عورتوں کی رعایت کے اعتبار سے بے فائدہ ہے۔

تنبیہ: بیہقی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے سال کے بعد چھٹی ہوتی تھی۔

عن عبداللہ بن کعب بن مالک الانصاری ان جیشا من الانصار کانوا بارض فارس مع امیر ھم و کان عمر ؓ یعقب الجیوش فی کل عام فشغل عنھم عمر ؓ فلما مر الاجل قفل اھل ذالک الثغر فاشتد علیہ و اوعد ھم و ھم اصحاب رسول اللہ ﷺ قالوا یا عمر انک غفلت عنا و ترکت فینا الذی امر بہ النبی ﷺ من اعقاب بعض الغزیۃ بعضاً.

حضرت کعب بن مالک انصاری ؓ کے بیٹے عبداللہ سے روایت ہے کہ انصار پر مشتمل ایک لشکر سرزمین فارس میں اپنے امیر کے ساتھ تھا۔ حضرت عمرؓ سال میں ایک دفعہ لشکروں کے متبادل بھیجتے تھے (تاکہ سال بھر جہاد میں رہنے والے اپنے گھروں کو چلے جائیں)۔ حضرت عمرؓ کو ان کا متبادل بھیجنا یاد نہیں رہا۔ جب سال پورا ہو گیا تو وہ حضرات (مدینہ منورہ) واپس چلے آئے۔ حضرت عمرؓ ان پر ناراض ہوئے اور دھمکی سنائی۔ وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے صحابہ تھے۔ انہوں نے جواب دیا اے عمر آپ نے ہم سے غفلت برتی اور ہم مجاہدین کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے جو حکم دیا تھا اس کو آپ نے چھوڑا کہ مجاہدین کو ایک سال کے بعد چھٹی دی جائے اور ان کا متبادل لشکر بھیجا جائے۔

پھر عورتوں کی رعایت کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے شادی شدہ کے لئے مدت کو سال سے گھٹا کر چار ماہ کر دیا۔

iii- مولانا سعید خان صاحبؒ کی بے قاعدگی

حضرت عمرؓ کے چار ماہ والے حکم کے بارے میں مولانا سعید خان صاحبؒ نے

عجیب بات کہی۔ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت عمرؓ نے حکم جاری کرنے کے لئے اپنے اہل مشورہ سے مشورہ نہیں لیا اور دوسرے مسائل کی طرح اس پر اجماع نہیں کرایا جیسے تراویح، تین طلاق ایک مجلس میں دینے پر کیا۔ دوسرے اپنی بیٹی سے رائے لی، اپنی بیوی اور دوسری عورتوں سے نہیں پوچھا اور اس میں حالات مختلف ہوتے ہیں۔ اور حضرت حفصہؓ نے بھی اجتہادی رائے دی۔ تیسرے حضور ﷺ سے اس بارے میں کوئی صراحتاً کنایۃً کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی اور نہ ہی حضرت ابوبکرؓ سے...... تو حکم مواقع کے اعتبار سے دیکھا جائے گا اور ضرورت کے اعتبار سے۔ اور اس زمانہ میں جب کہ کہیں اعتقادی ارتداد اور کہیں عملی ارتداد ہو رہا ہے اور امت کے رہنماؤں میں اختلاف اس قدر بڑھ چکا ہو کہ وہ اپنے مسائل میں خود پریشان ہو گئے ہوں تو اس وقت کا حکم کیا ہوگا؟ یہ دعوت کی بصیرت رکھنے والوں سے مشورہ کرنا پڑے گا تاکہ وہ ہر شخص کا حال دیکھ کر اور اس پر تفقد احوال کر کے ہر ایک کو جماعت میں بھیجیں اور الحمد للہ اب تک جتنے آدمی اللہ کی راہ میں دور دراز کے لئے گئے ہیں۔ چھ ماہ سال کے لئے گئے ہیں کوئی ایسی بات ان کے گھر والوں سے سرزد نہیں ہوئی جو حضرت عمرؓ کے حکم کو یاد دلائے۔ (مکاتیب حضرت مولانا سعید احمد خان ص 91,92)

ہم کہتے ہیں کہ اصل حکم سے وقتی طور پر صرف نظر کرنے کے باوجود ہم مولاناؒ کی اس عبارت میں کئی سقم پاتے ہیں:

1- حضرت عمرؓ پر ہر ہر مسئلہ میں مشورہ لینا کوئی ضروری تو نہیں تھا۔ بس اتنی بات کافی تھی کہ حضرت عمرؓ نے ایک حکم جاری کیا (جب کہ ہمیں یہ حکم نبوی ہے **علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المھدیین** اور یہاں تو ایک حکم عام تھا) جو یقیناً دیگر صحابہ کے علم میں آیا لیکن کسی نے مخالفت نہیں کی۔

2- حضرت حفصہؓ کی اس وقت حیثیت صرف عمرؓ کی بیٹی کی نہ تھی بلکہ ام المومنین کی تھی اور ان سے بڑھ کر اور کون ہوگا۔

3- اس مسئلہ کا تعلق عورتوں کی فطرت سے ہے اس لئے حضرت حفصہؓ کی بات اجتہادی رائے نہ تھی بلکہ فطرت کی تحقیق تھی۔ اور اگر ان کو تحقیق نہ ہوتی تو وہ جواب ہی نہ دیتیں۔ ان کا

جواب دینا اور حضرت عمرؓ کا اس کو قبول کر کے حکم عام بنانا اور کسی صحابی کا اس پر انکار نہ کرنا استنے دلائل کے باوجود مولانا سعید خان صاحب اس پر مطمئن نہیں اور چودھویں صدی میں دعوت کی بصیرت رکھنے والوں کے مشورہ پر موقوف کرتے ہیں۔

4- یہ بات مولانا نے عجیب کہی کہ چھ ماہ سال کے لئے نکلنے والوں کے گھروں میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو حضرت عمرؓ کے حکم کو یاد دلائے۔ گویا مولانا کے نزدیک یہ بھی کوئی ضابطہ ہے کہ حادثہ ہونے کے بعد شریعت کا حکم یاد کرو پہلے سے یاد کر کے اس کے مطابق عمل کو اختیار نہ کرو۔

5- حضرت عثمان ؓ نے جمعہ کی پہلی اذان شروع کرائی حالانکہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر بلکہ حضرت عمرؓ سے بھی اس کے بارے میں صراحت یا کنایۃ کچھ منقول نہیں لیکن اس کے باوجود ان کا عمل حجت ہے تو ایسے ہی حضرت عمرؓ کے عمل کے حجت ہونے کے لئے یہ کونسی شرط ہے کہ رسول اللہ ﷺ یا حضرت ابوبکرؓ اس بارے میں کسی طرح سے منقول ہو۔

آٹھویں بحث

مولوی طارق جمیل اور غیر مقلدین

مولوی طارق جمیل صاحب کہتے ہیں۔

"غیر مقلدیت شروع سے چلی آ رہی ہے۔اصحاب ظواہر (امام داود ظاہری) اب ان کو کون کہے گا کہ یہ گمراہ فرقے میں سے ہیں اور فرق باطلہ میں سے ہیں یا شوکانی کو کون کہے گا یا ابن حزم کو...... اصل دین میں یہ لوگ اہلسنت والجماعت میں۔ فروع میں وہ ظاہر پر چلے تو کہیں کہیں وہ دائیں بائیں ہو گئے......"۔

ہم کہتے ہیں

کہ امت کے جو تہتر فرقوں میں بٹنے کا ذکر ہے تو ان میں ایک فرقہ تو وہ ہے جو پورا پورا اہلسنت والجماعت ہے عقائد میں بھی اور اصول میں بھی۔ باقی بہتر فرقے گمراہ ہیں اس معنی میں نہیں کہ وہ کافر ہیں بلکہ اس معنی میں گمراہ ہیں کہ انہوں نے اہلسنت کے اصول وعقائد کے راستے سے انحراف کیا ہے اور ان کو گمراہ یا بدعتی کہنا جائز ہے۔

1- اعتقاد میں غیر مقلدین کا اہلسنت سے انحراف

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مولانا گنگوہیؒ کی خدمت میں مولوی طارق جمیل صاحب کی کہی ہوئی جیسی بات پیش کر کے اپنا سوال قائم کیا۔مولانا نے لکھا تھا۔

"......مثلاً تقلید شخصی کہ عوام میں شائع ہو رہی ہے اور وہ اس کو علما اور عملا اس قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ تارک تقلید سے گو کہ اس کے تمام عقائد موافق کتاب وسنت کے ہوں اس قدر بغض ونفرت رکھتے ہیں کہ تارکین صلاۃ فساق و فجار سے بھی نہیں رکھتے۔ اور خواص کا عمل وفتوی وجوب اس کا موید ہے گو خود ان کو علی سبیل الفرض اتنا

غلو نہ ہو...... اور مفاسد کا ترتب یہ ہے کہ اکثر مقلدین عوام بلکہ خواص اس قدر جامد ہوتے ہیں کہ اگر قول مجتہد کے خلاف کوئی آیت یا حدیث کان میں پڑتی ہے ان کے قلب میں انشراح و انبساط نہیں رہتا بلکہ اول استنکار قلب میں پیدا ہوتا ہے پھر تاویل کی فکر ہوتی ہے خواہ کتنی ہی بعید ہو اور خواہ دوسری دلیل قوی اس کے معارض ہو بلکہ مجتہد کی دلیل اس مسئلہ میں بجز قیاس کے کچھ بھی نہ ہو بلکہ خود اپنے دل میں اس تاویل کی وقعت نہ ہو مگر نصرت مذہب کے لئے تاویل ضروری سمجھتے ہیں۔ دل یہ نہیں مانتا کہ قول مجتہد کو چھوڑ کر حدیث صحیح صریح پر عمل کر لیں۔ بعض سنن مختلف **فیھا** مثلاً آمین بالجہر وغیرہ پر حرب وضرب کی نوبت آ جاتی ہے۔ اور قرون ثلاثہ میں اس کا شیوع بھی نہ ہوا تھا بلکہ کیف ما اتفق جس سے چاہا مسئلہ دریافت کر لیا۔ اگرچہ اس پر اجماع نقل کیا گیا ہے کہ مذاہب اربعہ کو چھوڑ کر مذہب خامس مستحدث کرنا جائز نہیں یعنی جو مسئلہ چاروں مذہبوں کے خلاف ہو اس پر عمل جائز نہیں کہ حق دائر و منحصر ان چار میں ہے مگر اس پر بھی کوئی دلیل نہیں کیونکہ اہل ظاہر ہر زمانہ میں رہے...... دوسرے اگر اجماع ثابت بھی ہو جائے مگر تقلید شخصی پر تو کبھی اجماع بھی نہیں ہوا۔ البتہ ایک واقعہ میں تلفیق کرنے کو منع لکھا ہے تاکہ اجماع مرکب کے خلاف نہ ہو جائے۔ باوجود ان سب امور کے تقلید شخصی کا استحسان اور وجوب مشہور و معمول ہے سو اس کا قبح کس طرح مرفوع ہوگا۔ دوسرا امر یہ کہ مسئلہ متکلم **فیھا** کے اعتقادی ہونے کی کیا صورت ہے بادی النظر میں تو فرعی عملی معلوم ہوتا ہے۔

مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے جواب میں لکھا۔

''اب تقلید کو سنو کہ مطلق تقلید مامور بہ ہے **لقولہ تعالیٰ فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون**. اور بوجہ دیگر نصوص۔ مگر بعد ایک مدت کے تقلید غیر شخصی کے سبب مفاسد پیدا ہوئے کہ آدمی بسبب اس کے اپنے دین سے لاابالی ہو جاتا ہے اور اپنی ہوائے نفسانی کا اتباع اس میں گویا لازم ہے اور طعن علماء مجتہدین و صحابہ کرام اس کا ثمرہ ہے...... لہٰذا تقلید غیر شخصی اس بدنظمی کے سبب گویا ممنوع من اللہ تعالیٰ ہو گئی۔ پس ایسی حالت میں تقلید شخصی گویا فرض ہو گئی اس واسطے کہ تقلید مامور بہ کی دو

نوع ہیں شخصی و غیر شخصی اور تقلید بمنزلہ جنس ہے اور مطلق کا وجود خارج میں بدون اپنے کسی فرد کے محال ہے۔

پس جب غیر شخصی حرام ہوئی بوجہ لزوم مفاسد تو اب شخصی معین مامور بہ ہوگئی اور جو چیز کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے فرض ہو اگر اس میں کچھ مفاسد پیدا ہوں اور اس کا حصول اس ایک فرد کے بغیر ناممکن ہو تو وہ فرد حرام نہ ہوگا بلکہ ازالہ مفاسد کا اس سے واجب ہوگا اور اگر کسی مامور بہ کی ایک نوع میں نقصان ہو اور دوسری نوع سالم اس نقصان سے ہو تو وہی فرد خالصۃ مامور بہ بن جاتا ہے اور اس کے عوارض میں اگر کوئی نقصان ہو تو اس نقصان کا ترک کرنا لازم ہوگا نہ اس فرد کا۔ یہ حال وجوب تقلید شخصی کا ہے۔ اسی واسطے تقلید غیر شخصی کو فقہاء نے کتابوں میں منع لکھا ہے۔

مگر جو عالم غیر شخصی کے سبب مبتلا ان مفاسد مذکورہ کا نہ ہو اور نہ اس کے سبب سے عوام میں ہیجان ہو اس کو تقلید غیر شخصی اب بھی جائز ہوگی۔"

(از ناقل۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جو پختہ عالم ہو اور تقلید غیر شخصی کرتا ہو مگر اس طرح سے کہ تقلید غیر شخصی کے سبب سے پائے جانے والے مفاسد سے بالکل خالی ہو کہ نہ دین سے لا ابالی ہو اور نہ اپنی ہوائے نفسانی کا اتباع کرتا ہو اور نہ ہی علمائے مجتہدین پر طعن کرتا ہو اور دوسرے اس طرح سے کہ اس کی وجہ سے عوام میں ہیجان اور تشویش و انتشار بھی نہ ہوتا ہو جو کہ اپنے مسائل کی تبلیغ سے ہوتا ہے۔ علامہ شوکانیؒ نے کہیں بھی اپنے مذہب کی تبلیغ و تحریک نہیں کی۔ کسی کے پوچھنے پر مسئلہ بتانا اور بات ہے اور لوگوں کو اس طرح تبلیغ کرنا کہ تم سنت کے خلاف کر رہے ہو جیسے میں کہتا ہوں اس طرح کرو تب سنت پر عمل ہوگا یا کہنا کہ اہلحدیث بن جاؤ یہ اور چیز ہے۔ مولانا داؤد غزنوی میں بھی انصاف ملتا ہے لیکن غیر مقلدین علماء کی اکثریت ایسی نہیں ہے اور اب سے نہیں شروع سے ہی ایسی ہے)۔

"اس مسئلے کے باب عقائد میں سے ہونے کا سبب دریافت فرمایا ہے سو غور کیجئے کہ جو امور مبتدع اور محدث ہیں ان سب کو ناجائز اور اور موجب ظلمت عقیدہ کرنا واجب ہے۔ پس یہ اعتقاد کلیات میں داخل ہے اگرچہ عمل ان کا عملیات سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتب کلام میں جواز مسح خف و جواز اقتداء فاسق و جواز صلوٰۃ علی الفاسق بھی

لکھتے ہیں کیونکہ اگر چہ یہ اعمال میں مگر اعتقاد جواز اعتقادیات میں داخل ہے۔

2-اصول میں اہلسنت سے انحراف

یہ مسلمانوں کا طے شدہ ضابطہ ہے اور اس پر خیر القرون سے تعامل چلا آ رہا ہے کہ مسلمانوں کے سب فقہی مذاہب قران وحدیث پر مبنی ہیں اور اللہ کے ہاں سب مقبول ہیں۔ اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ دوسرے کو ایک فقہی مذہب چھڑا کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرے مثلاً حنفی کسی شافعی کو حنفی بننے کی تبلیغ کرے اور شافعی کسی حنبلی کو شافعی بننے کی دعوت دے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں۔

لماحج المنصور قال لمالک قد عزمت ان آمر بکتبک هذه التی صنفتها فتنسخ ثم ابعث فی کل مصر من امصار المسلمین منها نسخة و آمرهم بان یعملوا بما فیها و لا تعدوه الی غیره فقال یا امیر المومنین لا تفعل هذا فان الناس قد سبقتهم الیهم اقاویل و سمعوا احادیث و رووا روایات و اخذ کل قوم بما سبق الیهم و اتوا به من اختلاف الناس فدع الناس و ما اختار اهل کل بلد منهم لا نفسهم. (حجة الله البالغة ص 145 ج 1)

جب عباسی خلیفہ منصور حج پر گیا تو اس نے امام مالکؒ سے کہا کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جو کتابیں آپ نے تصنیف کی ہیں ان کے کئی نسخے کروا کے مسلمانوں کے ہر شہر میں ان کا ایک نسخہ بھیج دوں اور سب لوگوں کو حکم دوں کہ وہ صرف اس پر عمل کریں اور دوسروں کو چھوڑ دیں۔ امام مالکؒ نے جواب میں فرمایا اے امیر المومنین ایسا نہ کیجئے کیونکہ مختلف علاقوں کے لوگوں کو صحابہ کے اقوال پہنچ چکے ہیں اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں سن رکھی ہیں اور ان کو روایتیں ملی ہیں اور اس وجہ سے ہر علاقہ کے لوگوں نے اپنے تک پہنچی ہوئی حدیثوں پر عمل کو اختیار کیا ہے تو آپ لوگوں کو اور جو عمل انہوں نے اپنے لئے اختیار کیا یونہی چھوڑ دیجئے۔

لیکن غیر مقلدین اس اصول اور ضابطہ کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہیں اور کرتے رہے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے اتنے اہلحدیث بنا لیے ہیں۔